

سہرا لکھو

روپے پیسے میں تو بخشش کی حد پانچ روپے سے زیادہ نہیں ہو سکتی تھی۔ مگر جیسے کوئی بھی سمجھ دار شخص، تنخواہ سے زیادہ ساتھ میں ملنے والی مراعات پر زیادہ نظر رکھتا ہے، اسی طرح سکریٹا بھی۔ بیبیوں کی طرف سے پہنچائے جانے والے کئی کئی دن پرانے نیچے ہوئے کھانوں، جن میں کبھی کبھی اتفاقاً کوئی تازہ پکائی گئی ڈش بھی شامل ہو جاتی تھی اور استعمال شدہ مردانے کپڑوں کے لیمن دین میں ہی خوش تھا۔ اسے یاد نہیں پڑتا تھا کہ کبھی اس نے اپنے لیے نئے کپڑے بنانے کا تردد کیا ہو۔

اب یہ اور بات تھی کہ احاطے کے گھروں سے ملنے

آج صبح سے ہی نیم گرم ہوا چل رہی تھی۔ احاطے کا برما سارا زنگ شورہ پھاٹک پورے کا پورا کھلا ہوا تھا۔ اگرچہ یہ "انٹظامیہ" کے قواعد کی خلاف ورزی تو تھی مگر پھاٹک پر کھڑے سکریٹا غریب کی بھی اپنی مجبوریاں تھیں۔

احاطے میں رہنے والی ساری بیبیوں کا آپس میں اتفاق رائے مثالی تھا۔ سوان کی مشترکہ خواہش پر اسے یہ خدمت سرانجام دینا ہی پڑتی تھی۔

بدلے میں شام ڈھلے گھروں کو لوٹنے والے مردوں کی جھڑکیاں اور درخواست کر دینے کی دھمکیاں۔

پر پھیلا بھی ساری کی ساری دیا لو اور غریب پرور۔

ٹاولیٹ



کی امی کو ان کی پسند گروہ ہمو کے ہاتھوں زچ کر داتے ہوئے انہیں بڑی کیمنی سی خوشی حاصل ہوئی تھی۔ رضوانہ سبزی لے کر واپس اندر جا چکی تھی۔ آج اسے لان کے سوت لینے شاپنگ پر جانا تھا اکل ہی علیم نے اسے پیسے دیے تھے سو آج وہ بے حد جلدی میں تھی۔

"چلو جی، اللہ مالک ہے۔ آخر کو میری زری کا نصیب بھی کہیں نہ کہیں تو کھٹے گا ہی۔"

زری کی امی نے صبر کا گھونٹ بھرتے ہوئے وہ سری طرف متوجہ ہونا چاہا۔ پر دل چلانے والے اس موضوع کی گونج یہاں اب بھی باقی تھی۔

"دونوں ہاتھوں سے پیسہ لٹا رہی ہے۔ پچھلے سال گرمی کے موسم میں ہی تو شازئی ہوئی تھی۔ درجن بھر لان کے سوت جینز میں لائی تھی۔ اور دس دن بعد ہی یہاں پر بھی شاپنگ کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ کچھ کم نہیں تو پندرہ بیس سوت تو رضوانہ نے یہاں بھی آتے ہی سلوا لیے تھے۔ ٹھیک کہہ رہی ہوں ناں زیتون آیا۔"

قریب کھڑی نازی، زیتون آیا سے تصدیق چاہ رہی تھی۔ ان کی ساری توجہ فی الوقت "ہر مال" والے پھیلے پر تھی۔ سستے پلاسٹک کے برتنوں پر منٹکے والے برتنوں جیسے پرنٹ چھانٹنے میں مصروف تھیں۔ ایسے ڈیزائن، جن کے بارے میں انہیں کیا یقین ہو تا کہ دیکھنے والے سو فیصدی دھوکا کاجائیں گے، پر مصروفیت چاہے جو بھی ہو، اس وقت جو یہ پھجڑی سی پکتی تھی۔

اس کی لذت سے کوئی بھی محروم نہیں رہنا چاہتا تھا۔ زیتون آیا کو بھی پھیلے رضوانہ کے جوڑوں کی صحیح تعداد یاد تھی یا نہیں، مگر نازی کی بتائی گئی تعداد سے متفق ہونے میں ذرا سا بھی تاہل نہیں تھا۔ "کیوں نہیں اڑائے گی بازاروں میں پیسہ، آخر کو کوئٹہ جیسے شہر سے آئی ہے۔ شاپنگ کا جسکے تو وہیں سے لگا کر لائی ہے۔"

اپنی بات کہتے ہوئے وہ ٹھٹھا مار کر ہنس پڑیں۔ وجہ اپنی کئی بات سے لطف اندوز ہونے سے زیادہ ایک

بہت سی خوش نماؤں پر اس نظر آجانے کی خوشی تھی۔ نازی کو اس وقت نہ ان کا بیسوا چھاگا اور نہ ہی۔ "شاپنگ کا شوق بھلا کس عورت کو نہیں ہوتا۔" خود وہ بھی پندرہ سولہ سال پہلے جب یہاں شادی ہو کر آئی تھی تو یہی میں بندھے گئے ہی ارمان ساتھ تھے۔

مسن چاہی زندگی، جان چھڑکنے والا شوہر، نت نئے کپڑے زیور اور تفریحی مقامات کی تو اس نے باقاعدہ درجہ بندی کی ہوئی تھی۔ کہاں پہلے جانا ہے اور کہاں بعد میں، اور کہاں بار بار۔ اور یہ بار بار والی جگہ، کراچی جیسے شہر میں سی ویو کے علاوہ اور کون سی ہو سکتی تھی۔ مقفی سے شادی تک کے وقفے میں ملتان کی چلا اتی کر میوں کے تھے موسم اس نے اسی سمانے تصور کے ساتھ بڑے آرام سے کائے تھے کہ اب بہت جلد وہ اور سرائ ہوں گے اور ساحل پر ان دونوں کے قدموں تلے پچھلی ریت، جس پر وہ کھنٹوں چمچل قدمی کرتے ہوئے بھی نہ پھسلے گئے اور جب کوئی بڑی سی لہریاں آکر پیروں کے نیچے سے ریت سرکائے گی تو۔! "اسے سوچ کر ہی کتنا مزہ آتا تھا۔

ایک وقت ہوتا ہے نا ایسا۔ جب ہر ایک کو اپنے ہر خواب کی تعبیر پالنے کا سو فیصد یقین ہوتا ہے۔ نازی کو اپنی بے حد گوری رنگت اور بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں کے بل پر ایسا ہی بھروسہ ایک سو دس فیصد تھا۔ پر اب وہ بے حد گوری رنگت بھی جھائیوں تلے دب کر گب کی کھوچکی تھی۔

اور بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں پر بھی موٹے عد سے والا چشمہ لگ چکا تھا۔ باقی رہے خواب۔

تو خواب بھلا کب مرتے ہیں۔ بس کھو جاتے ہیں۔

نازی کی ساری فرسٹریشن دوسرے پر تنقید کر کے نکلتی۔ خاص طور سے ان پر جو اسے اپنے سے بہت بہتر حالت میں محسوس ہوتے۔

احاطے کی مثالی اتحادی بیبیوں کے درمیان دلوں میں چھپا کر رکھا حسد بڑا فطری تھا۔

"یہاں تو وہی پرانے بدرنگ جوڑے نصیب میں لکھے ہوئے ہیں۔ جو پھٹ کر ہی جان چھوڑتے ہیں۔"

مرے ہوئے ماں باپ کی شرافت کا بھی کوئی لحاظ نہیں۔“

قریب کھڑی بڑوسن نے مزید ٹکرا لگایا۔
خانم اتنی دیر میں بالکل قریب آچکی تھی۔
”السلام علیکم!“

اس کی نرم اور واضح آواز سب ہی نے سنی، مگر ذرا سا رخ دے کر کھڑی وہ ساری عورتیں جیسے ایک دم ہی اوروں کے بالکل بے نیاز ہو کر اپنی باتوں میں بے حد مصروف ہو گئیں۔

”وعلیکم السلام باجی!“

سلام کا جواب دینے کا فریضہ ”نزدیک کھڑے دونوں“ بھیلے والوں نے نبھایا۔

خانم چند لمحے ان سب کی طرف دیکھے مگر جو اسے قطعی گھاس ڈالنے کے موڈ میں نہیں تھیں۔ پھر کچھ مالوس سی ہو کر سبزی کے بھیلے کی طرف متوجہ ہو گئی۔

عام طور پر وہ اپنی ضرورت کی سب چیزیں انوار کو مارکیٹ جا کر خرید لاتی تھی۔ اس کے شوہر انوار صاحب کے پاس ایک چھوٹی سی پرانی گاڑی تھی۔ اس میں وہ خانم اور اسی کے آٹھ نو سال کے بچے کو بٹھا کر لے جاتے ہوئے نظر آتے تھے۔

بے نیازی برتنے والی ساری خواتین کی پوری توجہ اسی طرف تھی۔

آج شاید خانم کا ارادہ چائینر بنانے کا تھا۔ یہ ان سب نے وہ ساری سبزیاں جو وہ خرید رہی تھی دیکھ کر اندازہ لگایا تھا۔

صاف ستھرا چہرہ اور لباس، میک اپ کرتے ہوئے اسے شاید ہی کبھی کسی نے دیکھا ہو۔ اور ایمان داری کی بات تھی کہ اسے کسی میک اپ کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ اس کا چہرہ بے حد پُرکشش تھا۔

یہاں کھڑی ساری عورتوں کو اس کی پسلی شادی اسی طرح یاد بھی جیسے کل کی بات ہو۔

احاطے سے رخصت ہو کر جانے والی، اور بیاہ کر یہاں آنے والی کوئی بھی لڑکی، دلہن کے روپ میں اتنی

نازلی کا غم کم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔
نہ آدھ گلو ٹماڑ اور پودے کی گٹھی لینے کی غرض سے سبزی والے کے پاس آکر کھڑی ہوئی اور نہ ہی یہ نئی ٹینشن سر پر سوار ہوئی۔ رضوانہ کے خوش رنگ سوٹ آنے سے پہلے ہی منہ چڑاتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ وہ یہاں ابھی نئی تھی اس لیے اس کا نوٹس بھی زیادہ لیا جاتا تھا۔

زنتون آیا کا برتنوں کا سودا ملے یا گیا تھا۔ سودہ بھی سوچ کر بہت خوش تھیں کہ ان کے خریدے گئے برتنوں کی کتنی تحریف ہوئی۔ اور انہوں نے بھیلے کے مالک جیسے گھاگ کاروباری سے، کیسے آرام سے اپنی مرضی کے دام ملے کیے۔

”بالکل یہی ذرائع اور یہی رنگ میں نے ایک اور جگہ دیکھے تھے“ مگر قیمت اتنی زیادہ کہ تم تصور نہیں کر سکتیں۔“ وہ اپنے قریب کھڑی کسی دوسری عورت سے کہہ رہی تھیں۔ تب ہی اسی احاطے کی پچھلی دیوار کے ساتھ والے ”ممنوعہ“ علاقے کی طرف سے خانم آتی ہوئی دکھائی دی۔ ان کے ساتھ اوروں نے بھی تقریباً ایک ساتھ ہی اسے دیکھا تھا اور یہ بڑی بد مزگی والی بات تھی۔

”آج یہ کہاں اس وقت چلی آرہی ہے۔ خواجواہ ہی گھسنے کی کوشش کرے گی، میں تو بات کرنا بھی پسند نہیں کرتی۔“

نازلی نے ٹماڑ پودے کی تھیلی اٹھاتے ہوئے، اپنے گھر رہ جانے کا قصد کیا تو آپا زنتون نے تھوڑی سی خفگی سے اسے دیکھا۔

”تمہیں کیا ضرورت ہے اندر جانے کی“ آرہی ہے تو آنے دو، یہاں اسے کون لفٹ کراتا ہے۔ ڈھیٹ بن کر کھڑی رہے گی چند منٹ، کچھ شرم والی ہوتی تو یوں ہم سب کے بچ آکر کھڑی ہی کیوں ہو۔

”اور اگر شرم والی ہوتی تو ایسا کام ہی کیوں کرتی۔ اپنے باپ کی عمر کے آدمی سے نکاح پڑھوا کر کہیں دیدہ دلیری کے ساتھ یہیں اسی احاطے میں رہ رہی ہے۔ یہی کچھ کرنا تھا تو کم از کم کہیں اور جا کر ہی کر لیا ہوتا۔

مارے شرم کے اب زیادہ گھر سے نکلتے بھی نہیں۔
بھابھی تو زیادہ تر اپنے میکے ہی میں رہنے لگی ہے۔ صبح کو
میاں لے جاتا ہے۔ دفتر کے راستے میں ہی اس کا
میکہ بڑا ہے نا۔ پھر شام کو واپسی پر لے لیتا ہے، میں
رات کے کھانے کے بعد اکثر اس کے پاس جا کر بیٹھ
جاتی ہوں تو صرف اسی کم بخت خانم کی باتیں چھڑ جاتی
ہیں۔

سب ہی نے باجماعت ”ہج ہج“ کر کے افسوس کا
اظہار کیا۔

”کام بھی تو ایسا کیا خانم نے“ اچھی بھلی عزت سے
بھائی کے گھر میں رہ رہی تھی۔ یوگی کے کچھ سال نکل
ہی جاتے تھے۔ کل کو جوان بیٹا سارا بن جاتا مگر بس کیا
تھیں۔ تو یہ ہی کرنی چاہیے انسان کو۔

سنجیو کی کتاب کھانا خزانہ کی کامیابی
کے بعد لذیذ کھانوں کی ترکیبیں

اندین کھانے

سنجیو کیپور

قیمت : 250 روپے

ڈاک خرچ : 30 روپے

آج ہی گھر بیٹھے منگوانے کے لئے

280 روپے کا منی آرڈر یا ڈرافٹ

ارسال کریں۔

منگوانے کا پتہ

مکتبہ عمران ڈائن جسٹ

37 اردو بازار۔ کراچی

فون: 2216361

میں آج تک میں ملی تھی۔ جیسی کہ خام۔
اور یہ بات اس کے گزرتین مخالف بھی بناسی
پتلی ہٹ لے تسلیم کیا کرتے تھے۔

”آپ کی بچی اب کیسی ہے نازلی آپ! میں آنا چاہ رہی
تھی اسے دیکھنے کے لیے مگر۔“

خانم واقعی بڑی ڈھیٹ تھی۔ سبزی کا شاہر سنبھالے
اب پاس آکر خواہنا اپنی جگہ بنانے کی کوشش کر رہی
تھی۔

سال نازلی سے کیا گیا تھا۔ سو جواب دینے کی ذمہ
داری اس پر ہی تن پڑی تھی۔

”ٹھیک ہے وہ بالکل ایسی چو نہیں تو بچوں کو لگتی ہی
رہتی ہیں۔ اب تو سارے میں بھاتی پھر رہی ہے۔“

بڑی رکھائی سے جواب دے کر وہ پھر سے زیتون آپا
کی طرف متوجہ ہو گئی۔ حالانکہ برسوں جب احاطے
کے باہر سے اس کی چار سالہ بچی کو ماتھے سے پتے

ہوئے خون کے ساتھ خانم گود میں اٹھا کر لائی تھی۔
تب سے اب تک نازلی کا شوہر کئی بار کہہ چکا تھا کہ ان

لوگوں کو جا کر خانم کا شکریہ ضرور ادا کرنا چاہیے۔
”اللہ بچوں کو اپنی امن میں رکھے“ تھی جانیں

ہیں۔ مجھے تو آپ کی بچی کی بڑی فکر رہی۔“
نازلی کو اپنے عقب سے پھر اس کی آواز سنائی دی۔

مگر وہیں ہاں گھر کے بات کو بڑھانے میں دانش مندی
نہیں تھی۔ سو خاموش رہی۔

خانم کو لگا جیسے کسی نے بھی شاید اس کی بات سنی ہی
نہیں۔ چند لمحے وہ یوں ہی خاموش کھڑی رہی۔ پھر

واپس اپنے گھر کی طرف مڑ گئی۔
اور سب نے جیسے سکھ کا سانس لیا۔

نازلی کے گھر کی دیوار خانم کے مرحوم والدین کے
گھر سے ملی ہوئی تھی۔ جواب خانم کے بھائی بھابھی کی

ملکیت تھا۔ اسی حوالے سے اندرون خانہ حالات سے
سب سے زیادہ با علم بھی نازلی ہی رہتی تھی۔

”خانم کے اٹھائے گئے ایک غلط قدم نے سارے
گھر میں ویرانی پھیلا کر رکھ دی۔ بھائی بھانج غریب تو

زیتون آپا کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے مڑنے لگی تھیں۔ تب ہی رضوانہ جو دوبارہ کچھ لینے کے لیے یہاں آکھڑی ہوئی تھی دھیرے سے بول پڑی۔

”خانم کی بھابی کو تو خیر میں نے کبھی بھی گھر میں نکلتے ہوئے نہیں دیکھا۔ میرا تو خیال ہے کہ اس عورت کا دل لگتا ہی اپنے میکے میں ہے اور نہ اس طرح روزانہ اپنے گھر سے کون نکل سکتا ہے۔“

اس چھوٹے سے بھرے کا فوری طور پر بے حد برا منایا گیا۔

اگلے کی بیبیوں کا ”اتفاق رائے“ ایسے ہی تو مثالی نہیں کر جاتا تھا۔

”پہلے کب نکلتی تھی وہ بے چاری اس خانم کی ذمہ داری اس کے سر پر تھی۔ کبھی دو گھڑی کے لیے محلے کے کسی گھر میں بھی آکر نہیں بیٹھ پاتی تھی۔“

”تمہیں کیا پتا یہاں آئے ہوئے ابھی دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔“

خانم کی بھابی کی طرف داری کے لیے وہ ساری کی ساری متحد تھیں۔

رضوانہ بے چاری شرمندہ سی نظر آنے لگی۔

”ہمارے تو پورے محلے میں دو ہی ہو گئیں مثالی آتی ہیں۔ ایک خانم کی بھابی اور دوسری زیتون آپا کی بہو۔“ نازی نے حساب برابر کیا۔

رضوانہ کی شرمندگی افسوس میں بدلنے لگی۔ خود اس کا ان ”باصفات“ عورتوں میں کہیں بھی ذکر نہیں تھا۔

آج معمول سے زیادہ دیر ہو گئی تھی۔ مرد بے شک شام ڈھلے اونٹ تھے۔ پر بچوں کو تو جلد ہی آجانا تھا۔ بھوک بھوک کا نعرہ لگاتے ہوئے سو محفل درخواست ہوئی۔

زیتون آپا کا گھر سامنے والا تھا۔ کریم کلر کا چھوٹا سا گیٹ کب سے ان کے انتظار میں ادھ کھلا تھا۔ کبھی کبھی وہ واقعی دل ہی دل میں مغرور ہونے لگتی تھیں۔ ان کی ہونٹا دیدہ واقعی مثالی تھی۔



”سراج۔“

نازی نے پکارا تو اسے پہلی بار ہی تھا۔ غمزدہ معلوم اس کے لہجے میں ایسا کیا تھا کہ دس بار کی آواز پر نگاہ اٹھا کر دیکھنے والا سراج پہلی آواز پر ہی چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

”کیا بات ہے؟“

یہ وہی کی طرف بغور دیکھتے ہوئے اس نے دل ہی دل میں خود کو کئی قیاس کے گھوڑے دوڑائے۔

وہ اور سراج اور کالی پریت والا جوڑا جس کی بوہند جانے کس موڈ میں ایک بار تعریف کر گیا تھا پنے ہوئے وہ بڑے اہتمام سے تیار، دلی گھڑی تھی۔

”کہیں جا رہی ہو؟“ بڑے اُمید بھرے انداز میں وہ پوچھ بیٹھا۔ نازی کا دل ہی تو جل کر رو گیا۔

”مجھے کہاں جانا ہے۔“

”جہاں دل چاہے تمہیں کون سا میں نے کبھی منع کیا ہے کہیں آنے جانے پر۔“ بڑی سخاوت کا اظہار کرتے ہوئے سراج نے دونوں پرانے اخبار کا فلمی ایڈیشن پھر سے کھول لیا۔ جو وہ آج آفس سے واپسی میں ساتھ لیتا ہوا آیا تھا۔

”تو میں جاتی کہاں ہوں سارا دن گھر میں ہی پڑے رہنا ہے۔ گھر کے دھندے ہی کب ختم ہوتے ہیں۔“

نازی نے بمشکل خود کو تلخ ہونے سے روکا۔ مگر سراج پر عورتوں کی اس مشترکہ محرومی کے بارے میں میروں کی وہی ادلی ”مشترکہ“ بے حسی چھائی رہتی تھی۔

”تم عورتوں کے تو رونے ہی ختم نہیں ہوتے۔ ہر طرح کی آزادی ملی ہوئی ہے۔ پھر بھی دماغ ٹھکانے پر نہیں رہتا۔“

اس طرح کی ”عزت افزائی“ وہ اکثر ہی کر جاتا تھا اور جواباً نازی بھی کچھ نہ کچھ کہہ سن لیتی تھی۔ مگر اس وقت دل پر کچھ عجب طرح کی چوٹ پڑی۔ بھولے

بسرے خوابوں کی یاد پانی کے قطرہوں کی صورت چلوں
کے کناروں پر آکر ٹھہر گئی۔ خاموشی کا ایک چھوٹا سا
وقفہ جو ان دونوں کے درمیان آگیا تھا۔ سراج کو بھی
اپنی غلطی کا احساس دلا گیا۔

اپنی پسندیدہ ایکٹرس کی خوبصورت تصویر پر سے نگاہ
ہٹا کر اسے نازلی کی طرف دیکھنا ہی رہا۔

”کیا ہو گیا“ میں نے تو بس ایسے ہی ایک بات کہہ
دی تھی۔ ”اس کی اتنی ہوتی صورت دیکھ کر سراج کا
لہجہ کچھ نرم ہوا۔

نازلی لو اب اس سے اتنی بھی توقع نہیں رہتی تھی۔
یہ سب یقیناً ”اس کے“ تیار ہونے کا کمال تھا۔ اسی
خیال نے اسے براعتا دیا۔

”میں یہ کہہ رہی تھی سراج! آج تو تم آ بھی جلدی
گئے ہو۔ کیوں نہ ہم کہیں کھوٹے چلیں۔“

”اس موٹر سائیکل پر اتنے بڑے چار بچوں کے
ساتھ۔“ سراج کو کبھی کبھی نازلی کی ذہنی حالت پر شک
ہونے لگتا۔

”بڑے بچے تو اب یوشن پر جانے والے ہیں۔ دو
گھنٹے بعد آئیں گے۔ چھوٹی کو ہم ساتھ لے چلتے ہیں۔
واپسی پر ان لوگوں کے لیے کچھ کھانے پینے کو لے
آئیں گے۔“

وہ اپنے طور پر سارا پروگرام سیٹ کیے ہوئے تھی۔

”میں نے کی آخری تاریخیں ہیں۔ اس بار کتنا خرچ تو
اس چھوٹی کی دواؤں پر ہی ہو گیا۔ نہ تم لا روائی برتیں
اور نہ وہ احاطے سے باہر جا کر اپنا سر پھٹوا کر آتی۔ وہ تو
بھلا ہو بے چاری خانم کا جو روٹی بلکتی بچی کو گھر تک اٹھا
کر لے آئی۔“

سراج بہانے بہانے سے خانم کا احسان یاد دلاتا رہتا
تھا۔ مگر نازلی کا مسئلہ اس وقت خانم کے بجائے کچھ اور
تھا۔

”بچی کی دواؤں کی بھلی کئی اور جو تمہاری دونوں
بہنیں بچی کی طبیعت کے بہانے دو دو دن رہ کر گئیں۔
ان کی خاطر یہ رات میں تو جیسے کچھ خرچ ہی نہیں ہوا۔
انہیں تو بس بہانا ملنا چاہیے یہاں آ کر دھڑا دینے کا۔“

نازلی نے فوراً ہی اسے اصل ”خرچے“ یاد دلانے
میں نے کی بھلی آخری تاریخیں تھیں۔ مگر اسے اچھی
طرح پتہ تھا کہ سراج اپنے پاس ہر ماہ کتنے پیسے بچا کر
رکھتا تھا۔ جو اس کے اپنے ”شوق“ کی نذر ہوتے تھے۔

سراج بے حسی سے کان لپیٹے بیٹھا رہا۔ یہ اس کا
سب سے کارگر طریقہ تھا اور نازلی کے لیے اور بھی
زیادہ تکلیف دہ۔ ایسے شخص اور خود غرض انسان کے
ساتھ تقدیر پھوٹے جانے کا غم پھر سے تازہ ہونے لگتا۔

”اب اس آذر جواری کے گھر جا کر جو رات گئے
تک محفل جمی رہے گی۔ وہاں تو تمہارا بیوہ فوراً ہی
کھل جائے گا۔“ وہاں سی ہو کر اس نے آخر وہی
طعنہ دے ڈالا جو محلے کے سارے مردوں کو سب سے
زیادہ چھوٹا تھا۔ سراج بھی بلبلایا گیا۔

”ایک شریف آدمی پر اتنے گھٹیا الزام لگاتے ہوئے
تم عورتوں کو شرم نہیں آتی، ہفتے میں اگر ایک آدھ
رات دیر تک سب اس کے گھر بیٹھ جاتے ہیں تو تم
لوگوں نے معلوم نہیں کیا کیا مفروضے گھڑ لیے ہیں۔“

”اب لگانا برا۔ سچی بات ایسے ہی چھپتی ہے۔“
نازلی کو جیسے تسلی ہوئی۔ اتنی دیر سے سراج جو چپ
کی مار مار رہا تھا۔ اس کا ازالہ اکثر سچی آذر کے گھر میں
جمنے والی بیٹھک کے طعنے سے ہوتا تھا۔

”بچہ بچہ جانتا ہے کہ آذر کے گھر میں جو اکھلا جاتا
ہے۔ تم سارے مرد اپنے فائدے کے لیے اس بات کو
چھپاتے ہو، مگر کسی دن جو پولیس تک شکایت پہنچ گئی تو
سارے کے سارے رنگے ہاتھوں دھر لیے جائیں
گے۔“

سراج کا دل چاہا کہ ایسی بد زبان عورت کے کس
کردو ہاتھ تو لگا ہی دے، مگر اسے پتہ تھا کہ نازلی جو کچھ
بھی کہہ رہی ہے وہ احاطے کی ساری عورتوں کی
مشترکہ رائے ہے۔ سراج کے لگائے دو تھپڑ اس
مشترکہ رائے عامہ پر ذرہ بھر بھی اثر انداز ہونے والے
نہیں تھے۔

تب ہی لوہے کا بیرونی دروازہ زور سے بجایا۔
”آجاؤ بھئی، دروازہ کھلا ہے۔“

سراج نے آتھ ہٹ بھرے انداز میں زور سے کہا۔
 "نازی! آئی! آپ کو رادی نے بلوایا ہے۔"
 سامنے زیتون آیا کاپو تاکھڑا تھا۔
 نازی کو یاد آیا کہ زیتون آپا کی بیٹی نے لاہور سے
 کسی کے ہاتھ کچھ سالن بھیجا تھا۔ یقیناً "انہوں نے
 وہی دکھانے کے لیے اسے بلاوا بھیجا تھا۔"
 "ن سے کہنا میں ابھی آ رہی ہوں۔"

کچھ سوچ کر اس نے بچے کو جواب دیا تو وہ فوراً ہی
 دوڑتا ہوا واپس بھاگ گیا۔

سراج کی جلی کٹی سن لینے کے بعد دل تو نہیں چاہ رہا
 تھا کہیں بھی جانے کو مگر ایک تو تیار بھی وہ اس وقت
 بستہ لگا کر کوئی تھی اور دوسرے وہاں جا کر دل بھی
 بھل جاتا تھا چھوٹی کافراک تبدیل کر کے سراج کو
 اٹھانے دیتے ہوئے وہ ہر نظر آتی۔

سامنے ہی سکھیا کولڈر ٹکس کا کرٹ اٹھائے
 جاتا ہوا نظر آیا۔ اس کا رخ آذر کے گھر کی طرف تھا۔
 آج پھر مردوں کی محفل جمنہ تھی۔

یہ سارا اہتمام اسی سلسلے میں تھا۔ نازی کا دل اور بھی
 برا ہونے لگا۔

عورتوں کی کتنی ہی چھوٹی چھوٹی خواہشوں کا خون
 مردوں کے اس کارڈز پھیننے کی لت کے چھبے ہی ہوا
 ہوگا۔ نازی کے پاس ایسے بست سے تکلیف وہ
 مفروضے جمع رہتے تھے۔ جن کے بارے میں وہ پر یقین
 تھی۔ اور تو اور یہ سکھیا کم بخت بھی۔

"ہزار بار منع کیا ہے کہ کوئی ضرورت نہیں ہے یہ
 خدمت بجالانے کی۔ مگر ایک جو سنتا ہو۔ منہ ہی جو گرم
 کرتے ہوں گے یہ سب اور ہم لوگ جو اتنا خیال
 کرتے ہیں وہ تجھے کبھی بھی یاد نہیں رہتا۔"

سراج کی بخشش ہوئی جھنبھلا ہٹ سکھیا پر اتری۔
 وہ دانت نکالنے لگا۔

احاطے کی بھیل کتنی بھی دیا لو اور غریب پرور ہوں
 وہ دینے کے نام پر صرف وہی چیزیں دیا کرتی تھیں جن
 کے متعلق انہیں پورا پورا یقین ہوتا تھا کہ اب وہ ان
 کے کسی کام کی نہیں رہیں۔ جب کہ مرد زبان کے لاکھ

تخت سسی پر اس طرح کی سوچ بچار کے بجائے
 سیدھے سیدھے میسے پکڑا دیا کرتے تھے۔

خاص طور پر آذر بیگ کی کارڈز کی محفل میں تو اس
 کی تھوڑی سی خدمت کے صلے میں اچھی خاصی
 بخشش مل جایا کرتی تھی۔

"آج تو وہاں سلیم بھی پک رہی ہے۔ نازی باقی!۔"
 سکھیا نے محض اس کا موڈ بھال کرنے کے لیے
 یہ نئی خبر بھی سنائی۔

"اچھا! کون پکا رہا ہے؟"

وہ شخصکے انوار صاحب اور ان کی بیگم ان ہی
 کے صحن میں پک رہی ہے دیکھ۔"
 نازی کے چہرے پر تڑپ اٹھ گئی۔

خانم! اس کے میاں اور آذر مثلث کے تین
 زاویوں کی طرح ایک دوسرے سے جڑے ہوئے
 محسوس ہوتے تھے۔

احاطے کی پچھلی دیوار کے ساتھ اکثر ہی وہ چل
 قدم کرتے ہوئے نظر آجاتے تھے۔ یا پھر اپنے گھروں
 کے آگے بنائے ہوئے موتیا اور گلابوں کے پھٹنے کے
 قریب بیٹھے پاتیں کرتے دکھائی دے جاتے۔

زیتون آپا اپنے کمرے میں مینا بازار سجائے بیٹھی
 تھیں۔

نت نے سوٹ، شالیں، ہینڈ شیشس وغیرہ زیتون
 آپا کی بیٹی رہتی تو لاہور میں بھی مگر سوغا میں اس طرح
 پہننے جیسے وہ بنی میں رہتی ہو۔ اس وقت اس دلکش
 منظر سے زیادہ نازی کی لائی ہوئی اطلاع میں کشش
 تھی۔

"خانم کو تو کیا کہوں، مگر انوار صاحب تو کسی زمانے
 میں واقعی بھلے آدمی سمجھے جاتے تھے۔ انہوں نے کیسے
 اس آذر سے دوستانہ گانٹھ لیا ہے۔ سمجھ میں نہیں
 آتا۔ بلکہ میں تو یہ کہتی ہوں کہ محلے کے سارے
 مردوں کو شہر ہی انوار صاحب کی وجہ سے ملی ہوئی
 ہے۔" زیتون آپا تاسف سے کہنے لگیں۔

نازلی کا دل پہلے ہی بھرا ہوا تھا۔ سراج کے ساتھ ہونے والی تازہ لڑائی کا احوال بھی سناؤا۔

”دلچسپی تو مجھ میں سراج کو پہلے بھی کوئی خاص نہیں تھی زیتون آیا! نئی نئی شادی کے زمانے میں بھی جب شوہر بیویوں کے آگے غلام بنے گھومتے ہیں یہ اللہ کا بندہ ہمیشہ ہی تیوری پر بل والے رہا۔ اور اب تو جیسے اسے میرا وجود بھی گوارا نہیں ہے۔ بس چلے تو دھکے دے کر باہر کھڑا کر دے۔“

صورت حال اتنی تکلیف دہ تھی بھی یا نہیں۔ ایک بار بھی اس بات پر غور کرنے کے بجائے ’پا زیتون اس کا دکھ بانٹنے پر کمر بستہ ہو چکی تھیں۔

”یہ سراج تو شروع سے ہی ایسا ہے۔ اکیلا تھا اس لیے ماں بیٹیوں نے جی بھر کر بگاڑا ہے۔ وہ تو قسمت اچھی تھی، تو تم بھرے جیسی بیوی اسے مل گئی ہے۔“ نازلی کے ٹوٹے بکھرتے اعتماد کو زیتون آیا کی ایسی باتوں سے سہارا مل جاتا تھا وہ ایک آدھ بھر کر رہ گئی۔

”سراج کی قسمت تو اچھی سی ہے پر میری۔“ نازلی کی قسمت کی اس ”دل دوز“ کہانی کا ریکارڈ اتنے سالوں میں بچ بچ کر گھس چکا تھا۔ کسی کو بھی واقعتاً اس سے ایسی ہمدردی نہیں تھی جیسی کہ ظاہر کی جاتی تھی۔ بس باہمی مروت کا ایک سلسلہ تھا جو جاری تھا۔ اصل میں سب کو خانم کے قصے کو دہرانے میں آتا تھا جو ابھی تک نیا بھی تھا اور اس میں دلچسپی کے ایک سے زائد سلسلے نکلتے تھے۔

زیتون آیا کی ہوناویہ جتنی دیر میں چائے بنا کر لائی، نازلی لاہور سے معصومہ کے بھیجے گئے تحائف دیکھ کر فارغ ہو چکی تھی۔

معصومہ کی شادی کو فقط پانچ سال ہوئے تھے۔ لڑکا اپنے بڑے بھائی کے ساتھ جنرل اسٹور چلا رہا تھا اور ان ہی کے ساتھ رہتا تھا۔ والدین بھی حیات نہیں تھے۔ وہ لوگ خوش حال بھی تھے اور بے حد شریف بھی۔

یہ نازلی کی اپنی حتمی رائے تھی، معصومہ کے بھیجے گئے تحائف دیکھنے کے بعد۔

رضوانہ کے بعد اسے کسی پر اگر رشک آتا تھا تو معصومہ پر، جو ٹھانڈے سے زندگی بسر کر رہی تھی۔

”خدا برکت دے۔ معصومہ کے میاں نے بھائی اور بھتیجیوں کے ساتھ مل کر تیسرا اسٹور کھولا ہے۔“ زیتون آیا فخریہ لہجے میں بتا رہی تھیں۔

”اچھا، یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے، میری طرف سے بھی معصومہ کو مبارکباد دے دیجئے گا۔“

نازلی نے نیچے ہوئے دل کے ساتھ ’دنیا داری نبھائی۔

”وہیے خانم کھانا بہت مزے کا بناتی ہے۔ اس کی بھابی نے تو کچن مکمل طور پر اسی کے حوالے کر دیا تھا۔ بلکہ کچن کیا بڑا کھڑی کتنی خوبی سے اس نے سنبھالا تھا۔ سلیقہ مند تو بے حد ہے، یہ تو ماننا پڑے گا۔“

زیتون آیا کی بسو جو بے حد اچھی سمجھی جاتی تھی۔ اس میں شاید ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہ براہ راست کسی کی برائی شازدہ نازیہ کی گارتی تھی اب یہ تو دوسرے پر منحصر تھا کہ وہ اس کی اچھی بات کے رد عمل میں کوئی مخالف پہلو ڈھونڈ نکالے، جیسا کہ اس وقت نازلی اور زیتون آیا کر رہی تھیں۔

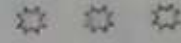
”کیا برا تھا اگر عزت سے بھائی کے گھر ہی بیٹھ جاتی، بیوگی کے بعد خون کے رشتوں سے بڑھ کر کون اپنا ہو سکتا ہے۔ مگر اس نے بھائی کی خفگی کی بھی پروا نہیں کی۔ زندگی بھر کا قطع تعلق منظور کر لیا۔“

”اور اب وہاں بھی تو آخر خد متیں ہی کر رہی ہے۔ انوار صاحب کی بیٹی داماد دوسرے رشتے دار آتے ہیں تو ہفتوں رہ کر جاتے ہیں۔ اور یہاں اس کے بھائی کے ہاں تو چھوٹی سی فیملی تھی۔ پھر بھی ہر وقت ایسی دکھائی دیتی تھی کہ جیسے معلوم نہیں کیسے ظلم توڑے جارہے ہیں اس پر، اور اگر کوئی مناسب رشتہ مل جاتا تو اس کی بھابی خود اپنے ہاتھوں سے یہ فرض انجام دے دیتی۔ بے چاری اب بھی اکثر ہی کہتی ہے۔“

نازلی بلا تکان بولے جارہی تھی۔

اپنی اپنی الجھنوں سے فرار حاصل کرنے کا یہی قاعدہ سب سے زیادہ عام ہے۔

دوسرے کی نفی کر کے، اپنے اندر جو ایک اطمینان اترتا ہوا محسوس ہوتا۔ وہی سکون زیتون آیا اور نازی کو بھی بے حد عزیز تھا۔



خانم نے گھبرائے ہوئے انداز میں گیٹ کھول کر باہر جھانکا۔ دھوپ اگرچہ تیز ہو چکی تھی۔ مگر احاطے کی چمک پھل اچھی ماند نہیں پڑی تھی۔ ساری سرگرمیاں "جاری و ساری" تھیں۔

اتنی دور سے بھی اس نے نازی زیتون آیا، رضوانہ اور زری کی امی کے ساتھ دو تین اور شناسا چہروں کو پہچان لیا تھا۔

یہاں سے ان لوگوں کو آواز تو نہیں دی جاسکتی تھی۔ اور ہاتھ کا اشارہ وہ لوگ دیکھ کر بھی انجان بن جاتیں اس کا سے پورا اندازہ تھا۔

ایک پریشان سی نگاہ گھر کے اندر ڈال کر وہ دوسرے ہی لمحے تیز قدموں سے ان لوگوں کی طرف چل پڑی۔ "زیتون آیا! پلیز ذرا آپ لوگ میری بات سن لیں۔"

رضوانہ کے گھر کے سامنے لگے گھنے سایہ دار درخت کے نیچے کھڑی وہ ساری عورتیں اسے آتا ہوا دیکھ چکی تھیں اور اس کے چہرے اور چال سے نمایاں ہوتی پریشانی کو بھی بھانپ لیا تھا۔ لیکن پھر بھی حسب معمول انجان بنی ہوئی تھیں۔

اس کی نرم آواز پر جیسے سب ہی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ مگر چونکہ اس نے مخاطب زیتون آیا کو کیا تھا اس لیے باقی سب نے اس بے ساختہ ہو جانے والی حرکت کے ازالے کے طور پر اپنی اپنی توجہ فوراً ہی دوسری جانب مبذول کر لی، درخت کے گھنے ٹھنڈے سائے میں محفوظ و مامون ان ساری خوش بخت عورتوں کے سامنے وہ جلتی ہوئی دھوپ میں کھڑی تھی۔ درخت کا سایہ اس کے پیروں کو چھو رہا تھا۔ اور اپنے گھر سے یہاں تک آنے میں اس کے چہرے پر پسینہ کے قطرے نمودار ہو چکے تھے۔

"انوار صاحب کی طبیعت بہت خراب ہو رہی ہے۔ انہیں ہاسپٹل لے کر جانا ہوگا۔ آپ اگر میرے ساتھ چلی چلیں تو۔۔۔" بہت عاجزی کے ساتھ کہتے ہوئے وہ انہیں پر امید نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

درخت کے سائے تلے ایک واضح جھنڈا ہٹ پھیل گئی۔ زیتون آیا کو ایک پل کے لیے کچھ خیال سا تو آیا مگر دوسرے ہی لمحے انہوں نے اس بے کار کے بوجھ سے خود کو آزاد کر لیا۔

"میں تو نہیں چل سکتی خانم! میری بہو کی طبیعت خود ٹھیک نہیں ہے اور بچے بھی اسکول سے آنے والے ہیں۔" سب ہی کے لیے ان کا جواب توقع کے عین مطابق تھا۔ صرف رضوانہ ہی کو تھوڑی سی حیرت ہوئی، کیونکہ ابھی تھوڑی دیر پہلے انہوں نے بتایا تھا کہ آج نادیہ کڑھی چاول پکا رہی ہے۔

"تو پھر کوئی اور اگر چل سکے۔ بڑی مہربانی ہوگی۔" خانم کے لمحے کی عاجزی مزید بڑھ گئی۔ چند لمحوں کے لیے تو وہ ساری ہی گڑبڑ سی گئیں۔ لاکھ ان سب نے خانم جیسی عورت کا اعلانیہ بائیکاٹ کر رکھا تھا۔ پر منہ پریوں صاف صاف منع کرنا ایک قطعی دوسری بات تھی۔

آنکھوں ہی آنکھوں میں جیسے کوئی پیغام بہت جگامی سی رفتار میں ایک دوسرے کو منتقل ہوا۔ "دیکھو خانم! ہم میں سے کوئی بھی نہیں جاسکتا، گھر پر اس وقت مرد بھی نہیں ہیں، اور ان کی اجازت کے بنا ہم کہیں آتے جاتے بھی نہیں ہیں۔"

یہ مشترکہ جواب نازی کی طرف سے آیا تھا۔ انکار کے ساتھ ساتھ اپنی فرماں برداری کے تذکرے کا مقصد، خانم کی گئی نافرمانی کو جتانا تھا۔ اس کا چہرہ تاریک سا پڑتا محسوس ہوا۔

"مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ میں کبھی اکیلی گئی بھی نہیں ہوں۔" اس کی آواز حلق میں پھنسنے لگی۔

سب سے پیچھے کھڑی رضوانہ سے بالکل بھی نہ رہا گیا تو آخر بول ہی پڑی۔

"آپ ایسا کریں گیٹ پر سے سکھیا کو ساتھ لے

لیں۔ ایسے موقع پر مرد ویسے بھی زیادہ اونچے مردگار ثابت ہوتے ہیں۔

خانم نے بڑی حیرت سے رضوانہ کی طرف دیکھا۔ وہاں کھڑی ساری عورتوں میں صرف رضوانہ ہی تھی جسے وہ سب سے کم جانتی تھی۔ کیونکہ اسے شادی ہو کر سال آئے ابھی بہت زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔
 ”آپ فوراً گھر جا کر انوار صاحب کو سنبھالیں میں گیٹ پر جا کر سکھیا سے کہتی ہوں کہ وہ ٹیکسی لے کر آپ کے گھر پہنچے۔“

رضوانہ حیرتی سے چہچہ سے نکل کر اس کے قریب آگھڑی ہوئی۔

اس حد درجہ پریشانی کے عالم میں اس بالکل غیر متوقع ہمدردی کی وجہ تاثر تھی۔

رضوانہ نے اس کے چہرے پر چمکتے ہوئے پسینے کے قطرے کے ساتھ اس کی آنکھوں میں اترتے ہوئے پانی کو بھی دیکھا۔

وہ تشکرانہ نظروں سے رضوانہ کو دیکھ رہی تھی۔

”آپ گھر جائیں سکھیا بس ابھی ٹیکسی لے کر آجاتا ہے۔“ رضوانہ جلدی سے کہہ کر تقریباً ”دوڑتی ہوئی گیٹ کی طرف چلی گئی۔

خانم کی آنکھوں میں تیرتے آنسو معلوم نہیں کیوں اسے اپنے گلے میں پھنستے محسوس ہو رہے تھے۔

وہ جو معتبہ تھی۔ گھر سے ”بھاگ“ کر شادی کرنے کا جرم کیے بیٹھی تھی۔ اور اب تاجر کا تاون اس کی قسمت میں لکھ دیا گیا تھا۔ اسی خانم کے ساتھ وہ بے سارنتی ہی درد کا رشتہ جوڑ بیٹھی تھی۔

اور ٹیکسی میں سکھیا کے ساتھ انوار صاحب کو ہسپتال لے جاتی ہوئی خانم نے سوچا تھا۔

”یہ بھی کیا کم خوش قسمتی ہے کہ سرد مہری اور بے حس کے اس دور میں کہیں نہ کہیں انسان بھی سانس لیتے ہیں۔“

رضوانہ کی جسارت کا سخت برا مانا گیا تھا۔

احاطے کی ساری دیوہیوں کی ”مشرکہ رائے“ کے

خلاف جا کر اس نے وہ غلطی کی تھی جو ناقابل معافی تھی۔ جس کے جرم میں آیا۔ اس نے کہا۔

”بہت زچہ توں آپا نے ہم سب نے منع کر دیا تھا تو پھر تمہیں اس خیر خواہی کی ضرورت کیا تھی۔ آخر کو ہمہی پیچھے پڑے۔“

زری کی اماں نے مزید ایک قدم اٹھایا اور اندر جا کر اس کی سانس سے بھی سارا قصہ کہہ سنایا۔

”کم از کم آپ سے تو پوچھ لیتی رضوانہ! بسوؤں پر کہیں زیب دیتا ہے اس طرح بچوں کی طرح احاطے میں بھانگے پھرتا۔“

رضوانہ کی سانس بھلی عورت تھیں شروع سے ایک تھلک رہنے کی علوی۔ کچھ سمجھیں کچھ نہ سمجھیں۔

”بالکل ایک ماحول سے آئی ہوئی لڑکی ہے۔ ہمارے طور طریقے سیکھنے میں وقت تو لگے گا۔“

”آپ نے بھی حد ہی کی۔ اپنے ماحول کی ہی کوئی

لڑکی لے لی ہوئی تو یہ مسئلہ نہ ہوتا۔“ زری کی اماں نے وہ بے لفظی میں انہیں ان کی غلطی کا بھی احساس دلایا۔ وہ پھر بھی کچھ ایسی متاثر نہیں ہوئیں۔

”کوئی بات نہیں پریشانی میں کسی کے کام آتا تو بڑے ثواب کی بات ہے۔ میری رضوانہ بڑی نیک سہل بنی ہے۔“

وہ اٹنا مسرور ہوئیں۔

شام تک احاطے کے سارے گھروں میں یہی کھجڑی کیے گئی۔ خانم کے بھائی کے گھر حسب معمول آج بھی تیار پڑا ہوا تھا۔ وہ لوگ رات گئے ہی گھر لوٹے تھے۔

شام کو سراج آیا تو گھر میں داخل ہونے سے پہلے ہی انوار صاحب کی علالت کا قصہ سن چکا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے ہسپتال سے آئے والا سکھیا اب گیٹ پر کھڑا گھروں کو واپس لوٹتے مردوں کو دیکھ کر رووا بڑی ذمہ داری سے فردا ”فردا“ سنا رہا تھا۔

انوار صاحب کی طبیعت اب پہلے سے بہتر تھی۔ مگر چونکہ بی بی بھی تھوڑا سا برصا ہوا تھا۔ اس لیے احتیاطاً

ہسپتال میں داخل ہو گئے تھے۔

کے لیے چند ضروری کام اور بھی تھے۔
گر میوں کی پھٹیاں شروع ہونے میں دو چار ہی دن
باقی رہ گئے تھے اور اس کا پکا ارادہ پہلے ہی ہفتے میں
اپنے میکے ملتان پہنچنے کا تھا۔

وہ ملتان جس کی گرم دوپٹوں میں اس نے کبھی
کراچی کے ٹھنڈے نم ساحلوں کے تصور باندھے
تھے۔

اب وہی گرد آلود گرم دوپٹیں، ایک ان چابی
کشش کے ساتھ اپنی طرف کھینچتی تھیں۔
بچوں کے کپڑوں پر ایک نگاہ ڈالنے کے لیے نازلی
کپڑوں کی ساری کھول کر کھڑی ہو گئی۔



انوار صاحب کچھ دن ہسپتال میں رہنے کے بعد
بخیریت گھر واپس آ چکے تھے۔

محلے کے سارے ہی مردان کی عیادت کے لیے
ہسپتال اور پھر گھر بھی ہو آئے تھے۔ جو بہت زیادہ
بیویوں کے زیر اثر تھے انہوں نے بھی کم از کم ٹیلی فون تو
کر ہی لیا تھا۔

رضوانہ کامیاں علیم، من موتی، لاپرواہ قسم کا تھا۔
اس کی زیادہ تر دوستیاں محلے سے باہر تھیں۔ یہاں اس
کی کسی سے بھی سلام دعا سے زیادہ بات چیت نہیں
ہو پائی تھی۔ سو انوار صاحب سے بھی بس اتنی ہی
تھی۔

ان کی بیماری کی خبر کو اس نے سنا بھی اور تھوڑی سی
تشویش کا اظہار بھی کیا۔ پھر اس کے بعد اپنی مصروفیت
میں گھر کر اسے کچھ یاد بھی نہ رہا۔ حالانکہ رضوانہ کا بڑا
دل چاہا کہ وہ کم از کم ایک بار تو انوار صاحب کو جا کر دیکھ
سکے۔ مگر اس کے بار بار یاد دلانے پر بھی علیم فرصت
نہیں نکال سکا۔

رضوانہ تھک بار کر خاموش ہو بیٹھی۔ چھوٹی چھوٹی
باتوں کو نظر انداز کرنے کی عادت اس کے قدم قدم پر
کام آتی تھی۔ پھر بھی دن میں جب کبھی اسے تھوڑی
سی بھی فرصت میسر آتی، آنسو بھری وہ آنکھیں اور

”خدا ہے تم عورتوں کی سنگ دلی پر، وہ خانم بے
جاری اکیلی اپنے چھوٹے سے بچے کو ساتھ لے کر وہاں
بیٹھی ہوئی ہے۔ اور تم میں سے کسی ایک کو بھی اس
کے ساتھ وہاں جانے کی توقع نہیں ہوئی۔“

محض چائے کا ایک کپ پی کر نازلی کو دس باتیں
سناتے ہوئے وہ انوار صاحب کو دیکھنے جانے کے لیے
اٹھ کھڑا ہوا۔ اسی طرح کی ہمدردیاں جب وہ خانم کے
ساتھ کرنے لگتا تھا تو نازلی کو خانم کے ساتھ ساتھ
سراج کے کردار پر بھی شک ہونے لگتا تھا۔ اس وقت
بھی بہت چڑ کر ہوئی۔

”ہمیں بھی اللہ کو جان رہی ہے۔ خدا خونی ہم میں
بھی ہے۔ مگر آنکھوں کی کبھی کبھی نگاہیں نہیں جاتی ہے۔
سراج صاحب! خانم نے دوسری شادی گھر سے بھاگ
کر کی ہے۔ سارے احاطے کے لوگ جانتے ہیں۔
اب ایسی عورت سے روابط بھاگ کر ہمیں کل کو اپنے
اور اپنی اولاد کے لیے مسئلے نہیں کھڑے کرنے۔“

”خانم نے بھاگ کر شادی نہیں کی تھی۔ اس کی
خالہ کے گھر رہی تھی نکاح کی تقریب۔ وہ بیوہ تھی۔
اور اپنے متعلق فیصلہ کرنے کی اجازت اسے مذہب
نے جب دی ہے تو ہم تم کون ہوتے ہیں فتوے لگانے
والے۔“

”ہوں! دور پرے کی خالہ۔“ نازلی نے منہ بگاڑتے
ہوئے سر کو ہلکا سا جھٹکا دیا۔

”محض خانہ پرانی کے لیے ان کے گھر کو استعمال کیا
خانم نے۔ اپنا مقصد جو پورا کرنا تھا اور نہ سکے۔ بھائی کی
عزت کا یوں تماشا بنانا کوئی چھوٹی بات نہیں ہے سراج!
لغت ہے ایسے بھائی پر، کم بخت بیوی کا غلام۔“

سراج کو دیر ہو رہی تھی۔ دھڑ سے دروازہ بند کرتا
ہوا باہر نکل گیا۔

وہ کبھی جو کسی بات پر نازلی سے اتفاق کر لیتا۔ اسے
یوں ہی تو تقدیر سے ہزار گلے نہیں تھے۔ کچھ دیر بچوں
پر چیخ چلا کر اس کا غصہ کم ہو ہی جاتا تھا۔ مگر آج اس نے
اپنے اس ”شوق“ سے پرہیز کرنا ہی بستر سمجھا کہ کرنے

لرزتے ہوئے ہونٹ یاو آکر دل میں ایک عجیب سی
چھین پیدا کرنے لگتے تھے۔

جانے کو تو وہ اکیلی بھی انوار صاحب کے گھر جاسکتی
تھی۔ اگر محفل والوں کا ڈر نہ ہوتا۔ انہوں نے ابھی
تک اس کی پہلی خطا ہی نہیں بخش تھی۔ اب اگر اسے
اکیلے وہاں جانا دیکھ لیتے تو بلا تامل خانم کے ساتھ اس کا
بھی بایکٹ کر دیتے۔

بہر حال اسے رہنا تو ان سب کے ساتھ ہی تھا۔ اور
وہ فطرتاً ہی بھی بے حد صلح جو قسم کی۔
پھر ایک دن یہ موقع اسے مل ہی گیا۔
گرمیوں کی چھتیاں شروع ہو چکی تھیں۔

اور سال بھر میں یہی دو مہینے ایسے ہوتے تھے جو
احاطے کی ساری سرگرمیاں ماند پڑ جاتیں۔ اسکول میں
پڑھنے والے بچوں کی اکثریت یا تو تنصیال میں تعطیلات
گزارنے جا چکی تھی یا ویسے ہی گھومنے پھرنے۔
کچھ گھرانے اپنے عزیزوں میں شادیوں کے مختلف
فنکشنز اینڈ کرنے بھی گئے ہوئے تھے۔

سارا سارا دن سناٹا چھایا رہنے لگا۔ پھیری لگانے
والوں کی آمد و رفت کا سلسلہ بھی ٹوٹا ہوا تھا۔ کبھی کبھار
اکاد کا کوئی آجاتا۔

اس روز بھی بہت انتظار کے بعد ایک سبزی والے
کی آواز سن کر رضوانہ باہر آئی تھی۔ نانڈی کے چلے
جانے سے خاص طور پر اس کا اپنا پڑوس بے حد خالی
خالی محسوس ہو رہا تھا کیونکہ محفل جمائے رکھنے کی
سب سے زیادہ شوقین بھی وہی تھی۔ حالانکہ کبھی کبھی
وہ بڑی ناقابل برداشت ہونے لگتی تھی۔ پھر بھی
رضوانہ کی نگاہ جب بھی اس کے چھوٹے سے گیت پر
لگے تالے پر پڑتی دل اداس ہونے لگتا۔

اس وقت بھی باہر سناٹا تھا رضوانہ کو جو جو سبزیاں
درکار تھیں وہ تلوالی گئی اور جب حساب کر کے پلٹ
رہی تھی تو وہی بانوس سی آواز سنائی دی۔

”کیسی ہو رضوانہ؟“ سامنے خانم کھڑی مسکرا رہی
تھی۔

”ارے آپ!“ رضوانہ کو اسے دیکھ کر بڑا اچھا لگا۔

اس روز کی ٹوٹی بکھری حالت کے برعکس آج وہ بڑی
مطمئن سی مسکراہٹ چہرے پر لیے ہوئے تھی۔
”کسے ہیں انوار صاحب؟ میں تو انہیں پوچھنے بھی
نہیں آسکتی۔“ رضوانہ کے لہجے سے شرمندگی جھلکنے
لگی۔

”ارے نہیں، کوئی بات نہیں۔“ خانم نے تھوڑا
سا آگے بڑھ کر اس کے کندھے کو چھوا۔ ”اب تو وہ
بالکل ٹھیک ہیں اس روز تو واقعی میں پریشان ہو گئی تھی
اور اگر تم ساتھ نہ دیتیں تو پتا نہیں میں کتنی دیر اور
پریشان ہوتی رہتی۔“

وہ بڑی محبت سے رضوانہ کو دیکھ رہی تھی۔ ”میں تو
اس وقت تمہارا شکریہ بھی ادا نہیں کر سکتی۔ تمہاری
وجہ سے مجھے بے حد سہارا ملا تھا۔“

”میں نے ایسا کیا کیا تھا؟ کچھ بھی تو نہیں۔“
رضوانہ حقیقتاً ”شرمندہ ہو رہی تھی۔“

”چھی بات تو یہ ہے کہ انوار صاحب اب بالکل
ٹھیک ہیں۔ آپ اندر آئیں نا۔ ایک کپ چائے ہی پی
لیں۔“

اپنی نرم دلی کے باعث رضوانہ نے بے ساختہ ہی
خانم کو دعوت بھی دے ڈالی۔ جو عرصہ ہوا اسے کسی کی
طرف سے ملنے کی توقع بھی نہیں رہی تھی۔

خود رضوانہ بھی اندر ہی اندر تھوڑی پریشان بھی
تھی۔

اگر جو خانم واقعی اندر آکر گئی تو یہ خبر چاروں طرف
گردش کرے گی۔ اور پھر علیم اور ان کی امی وہ دونوں
نہ جانے کس طرح کارو عمل ظاہر کریں گے۔ آخر کو
ہیں تو انسان ہی فطرتاً ”کانوں کے کچے“

مگر شاید خانم کو اسے کسی آزمائش میں ڈالنا گوارا نہ ہوا۔
”پھر کبھی سہی“ ابھی تو میں جلدی میں ہوں، کچھ
دوائیں اور دوسرا سامان لینا ہے۔“ ایک ہلکی سی
افسردگی کھلی مسکراہٹ کے ساتھ وہ بڑی شائستگی سے
منع کر رہی تھی۔

رضوانہ نے سکون کا سانس لیا۔

سامنے والے دروازے سے زیتون آیا آکر کئی بار

جھانک چکی تھیں۔ رضوانہ کو پتہ تھا کہ ان کی ساری توجہ اسی طرف ہے اور جب خانم کو خدا حافظ کہہ کر وہ گھر کے اندر چلی گئی تو کچھ ہی دیر بعد وہ اس کے پیچھے پیچھے اس کے ہاں پہنچ بھی گئیں۔

”انسان اپنی صحبت سے پہچانا جاتا ہے۔ اچھوں کے ساتھ ملو گے تو لوگ اچھائی سمجھیں گے اور اگر ہر کس و نا کس کے ساتھ ربط ضبط پر بھایا تو سچی بات ہے کہ دیکھنے والے کی زبان کو پکڑنا ممکن ہے۔“

”اور یہاں ہر ایک اپنا اپنا پات ترازو لے کر بیٹھا ہوا ہے۔ دوسروں کی اچھائی برائی کا حساب کتاب کرنے کے لیے۔“ زیتون آیا کی چائے میں شکر گھولتے ہوئے وہ خود اندر تک رخ ہونے لگی۔

”جو اختیار صرف اللہ تعالیٰ کا ہے۔ وہ ان کے بندوں نے کس آسانی سے اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔“ اس نے کڑھ کر سوچا۔

تب ہی اچانک کوئی باہر کا دروازہ ایک جھٹکے سے کھول کر اندر آیا۔

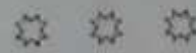
رضوانہ کا دل بہت زور سے دھڑکا۔
باورچی خانے کی کھڑکی سے زیتون آیا کی ہسوکو اندر آتے دیکھ کر وہ مارے گھبراہٹ کے فوراً ”ہی خود بھی صحن میں آکھڑی ہوئی۔“

”رضوانہ!“ نادیدہ کی آواز میں کپکپاہٹ بے حد واضح تھی۔ ”ای کو فوراً“ گھر بھیج دو۔ لاہور سے فون آیا ہے۔“

رضوانہ نے تھوڑا سا مڑ کر اپنی ساس کے کمرے کی طرف دیکھا۔

زیتون آیا ایک ہاتھ دل پر رکھتے ہوئے فوراً ”ہی اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔“

”میری معصومہ!“ ان کے لبوں سے بے اختیار ہی یہ دو الفاظ ادا ہوئے۔



گر میوں کی چھٹیوں کا اختتام ٹھیک برسات کے وسط میں ہوا۔

نازلی جب بچوں کو لے کر اسٹیشن پر اتری تو پانی نوٹ کر برس رہا تھا۔

ہوا کے تیز جھونکوں کے ساتھ پانی کا شور ریلوے اسٹیشن کے مخصوص شور و غل پر حاوی ہو چکا تھا۔

اسنے کمپارٹمنٹ کی کھڑکی سے جب اس نے جھانک کر دیکھا تو آسمان پر گمرے بادل چھائے ہوئے تھے۔

یہاں پر اترنا پھر من مانے کرائے پر ٹیکسی کرنا اور پھر گھر تک بغیر عافیت پہنچنا۔

نازلی کو سوچ کر ہی گھبراہٹ ہونے لگی۔ ملتان سے واپسی پر ہمیشہ کی طرح سامان پہلے سے دگنا ہو چکا تھا۔ سراج کو وہ اپنے آنے کی اطلاع دے چکی تھی پر اس دھواں دار موسم میں اس کے آنے کی امید ایک فیصد بھی نہیں تھی۔

مگر وہ وہاں موجود تھا اور اس کی موجودگی بڑی تسلی بخش تھی۔

تلی سے لے کر ٹیکسی والے تک وہ پیسوں کے معاملے میں جھگڑتا، پانی میں جان بوجھ کر چھپا چھپ کرتے ہوئے بچوں پر بکڑتے اور گھر آنے تک راستے میں وقفہ وقفے سے نازلی پر اپنی جھنجھلاہٹ اتارتے ہوئے وہ مستقل ہی بد مزاجی کا مظاہرہ کرتا رہا۔ بیوی بچوں سے تقریباً پونے دو ماہ کی دوری بھی اس کے مزاج پر کوئی اثر نہیں ڈال پائی تھی۔ بالکل دیسے کا ویسا۔ جیسا کہ وہ اسے چھوڑ کر گئی تھی۔

نازلی کے لیے حالانکہ کوئی بھی بات غی نہیں تھی۔ لیکن پھر بھی اسے کچھ بھی اتنا برا نہیں لگ رہا تھا جتنا ہمیشہ لگتا تھا۔ سراج کی کسی بھی بات پر کا جواب دینے کے بجائے وہ اسی طرح بے نیازی بیٹھتی رہی۔ جیسے یہ سب کچھ اسے نہیں کسی اور کو کہا جا رہا ہو۔

گھر تک پہنچتے پہنچتے خود سراج بھی بول بول کر شاید تھک چکا تھا۔ یا پھر نازلی کی مستقل خاموشی نے اسے کچھ احساس دلایا تھا۔

گھر آکر جب وہ لوگ سامان وغیرہ رکھ کر فارغ ہو چکے تو وہ خود ہی چائے بنا لایا۔

چند سال ہی چھوٹی تھی پر معلوم نہیں کیا رکاوٹ تھی جو ہر بار اس کا رشتہ طے ہوتے رہ جاتا۔ چپکلے دونوں ایک بار پھر ایسا ہی ہوا تھا۔

”اب تو سب ہی لوگ بے حد پریشان ہیں“ خاص طور پر میری اماں، تم یہاں کوئی اچھا لڑکا کیوں نہیں دیکھتے۔ سراج! کوشش تو کر کے دیکھو۔“ وہاں کی تفصیل سنا کر وہ پر امید نظروں سے سراج کو دیکھنے لگی۔ موضوع خود بخود بدل گیا تھا۔ اور معلوم نہیں کتنے عرصے بعد وہ دونوں اتنے دوستانہ انداز میں بات چیت کر رہے تھے۔

”رکھا تو سامنے ہی ہے“ ڈھونڈنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ مگر تمہیں پسند نہیں آئے گا۔ اسی لیے میں نے پہلے کبھی کہا ہی نہیں۔“

وہ کہتے ہوئے گردن کے نیچے تکیہ رکھ کر نیم دراز ہوا۔ اس بار تازی کو اس کے اطمینان پر واقعی غصہ آنے لگا تھا۔

”تمل ہے ہم سب اس قدر پریشان ہیں اور تم مٹھی میں اس پریشانی کا حل دہائے بیٹھے ہو۔ بتاتے کیوں نہیں؟ کون سا لڑکا ہے؟“ وہ جان کو آنے لگی تو سراج کو جتنا ہی پڑا۔

”آؤ!“ تازی نے بست حیرت سے یہ نام سنا۔ ”آؤ بیگ۔“ سراج کہہ رہا تھا۔ ”مجھ سے انوار صاحب نے کئی بار ذکر کیا ہے کہ میں آؤ کے لیے کوئی مناسب لڑکی دیکھوں۔ اچھا لڑکا ہے، مناسب آمدنی ہے۔ تقریباً اکیلا ہی سمجھو۔ چند ایک دو پرار کے رشتہ دار۔“

”بس۔۔۔ معاف کرو، مجھے نہیں سنی اس کی ہسٹری۔“ تازی نے جس کر اس کے آگے ہاتھ جوڑے۔

”میں ہی بے وقوف ہوں جو اپنا رونا تمہارے سامنے لے بیٹھی۔ ایمان داری سے گمراہ اگر جو نگہ تمہاری اپنی بسن ہوئی تو تم اتنی آسانی سے اس زمانے بھر کے لفظ آؤ کا رشتہ اس کے لیے پیش کر دیتے؟“

”کھانا وغیرہ پکانے کی ابھی ضرورت نہیں ہے۔ لا کر فریج میں رکھ دیا ہے۔ نکال کر گرم کر لینا۔“ چائے کا کپ تھماتے ہوئے وہ اس بار نرمی سے کہہ رہا تھا۔ تازی نے بات میں سر ہلا دیا۔ سراج کی سختی کی طرح اس نے اس کے لہجے کی نرمی کا بھی کوئی نوٹس نہیں لیا تھا۔

سراج نے کچھ چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ پہلی بار اسے احساس ہوا کہ وہ جب سے آئی ہے مستقل ہی کسی گہری سوچ میں ہے۔

”کیا بات ہے؟ ممکن میں تو سب خیریت ہے نا؟“ اس کا خیال فطری طور پر وہیں گیا۔

”ہاں!“ تازی کسی خیال سے باہر آئی۔ اس نے سراج کی بات ڈھنگ سے سنی ہی نہیں تھی۔ اسے اپنی بات نہ ہرانی پڑی۔

”ہاں سب ٹھیک ہے۔“ بڑے سرسری سے انداز میں جواب دیتے ہوئے وہ فوراً ہی اپنے اصل مقصد کی طرف آئی۔ ”میں ذرا زنتون آیا گئے گھر ہو آؤں سراج۔!“

”اس بارش میں باہر قدم رکھنا مشکل ہو رہا ہے اور تم کو آتے ہی مٹھے والوں کی یاد ستانی شروع ہو گئی ہے۔“ اس پر پھر سے جھنجھلاہٹ سوار ہونے لگی۔

تازی اپنی تکرار کی علت شاید ممکن میں ہی میں بھول آئی تھی۔ چند لمبے چپ چاپ اس کی شکل دیکھنے لگی پھر دھیرے سے بولی۔

”تم نے خود ہی تو فون پر بتایا تھا، بس اسی لیے جانا چاہا رہی ہوں، اور اب تو اس بات کو دن بھی بست ہو گئے ہیں۔“

”ہو جاتے ہیں زندگی میں ایسے حادثے بھی، بس خدا کی مرضی ہے۔“ سر کو ہلکی سی جنبش دیتے ہوئے سراج کہہ رہا تھا۔ ”میں منع نہیں کر رہا ہوں، چلی جانا تم ذرا پانی کو تو رکھنے دو۔ اور وہ نگہت کے رشتے کا کیا ہوا؟ ان لوگوں کی طرف سے جواب آیا کہ نہیں۔؟“

تازی نے ایک لمبائی سانس بھری۔ نگہت اس کی چھوٹی بسن کا نام تھا۔ اس سے محض

”بالکل کرتا“ اور صرف رشتہ ہی پیش نہیں کرتا۔ بلکہ کب کی یہ شادی بھی ہو چکی ہوتی۔“ سراج نے قطعیت کے ساتھ کہتے ہوئے دوسری طرف کروٹ بدل لی، اسی وقت برابر والے کمرے سے چھوٹی کے چیخ چیخ کر رونے کی آواز آنے لگی۔ تو وہ اسی طرح کروٹ بدلے کیے ہوئے زور سے بولا۔

”اب جا کر دیکھو نا اسے کیوں چیخ رہی ہے۔ دو مہینے اچھا بھلا سکون رہا گھر میں۔“

نازی اتنی دیر میں کمرے کے دروازے تک پہنچ گئی تھی۔ بمشکل تمام ہی جو اب ”خود کو کوئی سخت بات کہنے سے روک پائی۔“



ہوا کچی مٹی کی مہک سارے میں اڑائے پھر رہی تھی۔ اس بار ایک ذرا سا تیز جھونکا آیا تو گل مہر کے پتوں پر اٹکے ہوئے کتنے ہی پانی کے قطرے نزدیک بیٹھی معصومہ پر آگرے۔

ایک ٹھنڈا خوش گوار احساس بھی اندر کی تپش کو ذرا سا بھی کم کرنے میں مددگار ثابت نہ ہو سکا۔ بے زاری کے ساتھ ہاتھوں اور دامن کو جھٹکتے ہوئے اس نے آسمان پر نگاہ ڈالی۔

وہاں اب بھی گہرا سرمئی رنگ غالب تھا۔ اور یہی نیم تاریک سارنگ وہاں اس کے لاہور والے گھر کے آنگن میں کیسا جاودہ سا جگتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔

بے اختیار ہی اسے وہ صبحیں اور شامیں یاد آنے لگیں۔ مگر اب شاید یادیں شمار کرنا بھی ناممکن ہوتا جا رہا تھا۔

”قسمت کے لکھے کو تو پورا ہونا ہی ہوتا ہے اپنی طرف سے چاہے ہم کتنی ہی کوشش کریں۔“

بڑی کراری سی آواز میں برآمدے میں حلقہ بنا کر بیٹھی خواتین میں سے کوئی ایک تقدیر کے اسرار و رموز بیان کر رہی تھی۔

وہ سب روزانہ ہی اکٹھی ہو کر بیٹھتیں اور ایسی ہی گفتگو فرماتیں۔

معصومہ پر چھائی افسردگی، خطرناک حدوں کو چھوئے لگتی۔ ابھی کچھ دیر پہلے نازی بھی اس کے پاس آکر بست دیر بیٹھی رہی تھی۔ اور آتے ہی اسے گلے لگا کر چند آنسو بہانے کا فریضہ پورا کر کے وہ مستقل ہی مرحومہ کے ”بد بخت شوہر اور سسرال والوں“ کو بیٹھی بددعا میں دیتی رہی۔ جنہوں نے ایک ذرا اسی بات پر اسے طلاق دے کر نکال باہر کیا تھا۔

یہ قصہ حالانکہ اسے سراج کی زبانی ملتان میں ہی سننے کو مل گیا تھا۔ مگر اس وقت معصومہ سے تفصیلات معلوم ہونے کی امید تھی جو پوری نہ ہو سکی۔ معصومہ یوں ہی ہنس سی بیٹھی رہی۔

وہ سارے اہم پوائنٹ جو وہ یہاں آنے کے ابتدائی دنوں میں رو رو کر اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے بار بار دہراتی رہی تھی، اب ایک ایک کر کے خود ہی بھولتی جا رہی تھی۔

”کاش اگر میں ذرا اسی بات پر بحث کی عادت پر قابو پائے رکھتی تو شاید وہ بری گھڑی ٹل ہی جاتی۔“ اسے رہ رہ کر اپنے مہاں کی نرم خوئی یاد آتی۔

نازی اس کی مسلسل چیخ سے پور ہو کر واپس برآمدے میں جا بیٹھی تھی۔ جہاں وہ مخصوص گروپ براجمان تھا۔ آج کل احاطے میں جمع ہونا موقوف ہو چکا تھا۔ معصومہ عدت میں تھی۔ سوزیتون آپا کا دل بیٹی کو اکیلا چھوڑ کر باہر کی گپ شپ میں شریک ہونے کو نہیں مانتا تھا۔ اور چونکہ یہاں ان سب کا ایک مثالی تھا۔ سو وہ لوگ بھی باہر کے بجائے یہاں ان کے گھر میں ہی اکٹھی ہو بیٹھتیں۔

شروع شروع میں تو معصومہ کو بھی ان ڈھیر ساری ”محسنوں“ کے سہارے غم بٹھا ہوا لگنے لگتا۔ مگر وقت سے بڑا سفاک منصف اور کون ہے۔

اس قلیل سے عرصے میں ہی اسے پیروں تلے پیچھی زمین کے دلدلی ہونے کا احساس بڑی شدت سے ہونے لگا تھا۔

کچن سے چائے کی خوشبو آنے لگی تھی۔ برتنوں کی کھٹ پٹ بتا رہی تھی کہ نادیہ کچن میں ہی ہے۔ اس

سب کی نگاہ تادیب پر تھی۔ جواب معن میں داشتک
مشین لگا رہی تھی۔ کپڑوں کا ایک ڈھیر تھا۔ جو میلے
کپڑوں کے ریک سے برآمد ہو رہا تھا۔

اس روز زیتون آیا کے گھر سے واپس جاتے ہوئے
سب ہی نے باہر نکل کر ایک ہی بات کی۔

”معصومہ کو کچھ تو تادیب کا ہاتھ بٹانا چاہیے۔ لاکھ غم
سہی، مگر انسان کو دوسرے کا بھی خیال رکھنا چاہیے۔“
وہ بے چاری تو پس کر رہ گئی ہے۔ ان کے گھر میں۔

سامنے سے خانم جاتی ہوئی دکھائی دی۔ اپنے بچے
کی انگلی پکڑے وہ گیٹ کی طرف جا رہی تھی۔ مگر وہ
سب اپنی باتوں میں اتنی مصروف تھیں کہ انہوں نے
خانم کا بھی کوئی نوٹس نہیں لیا۔ معصومہ کے لیے دلوں
اور باتوں دونوں ہی میں ہمدردی کا رنگ بڑے غیر
محسوس سے انداز میں پکنا پڑنے لگا تھا۔

بہت سارے دن تیزی سے گزرتے چلے گئے۔
معصومہ کی عدت ختم ہوئے بھی کئی مہینے گزر چکے
تھے اور اس کی طلاق کے تلخ واقعہ کو بھی ”اللہ تعالیٰ
مرضی“ کہہ کر سب ہی اپنی اپنی ہمدردیاں واپس
سمیٹ چکے تھے۔

احاطے میں اب زیتون آیا سے زیادہ تادیب نظر آتی
تھی۔ کبھی سبزی لیتے ہوئے، کبھی کوئی پرانی شے ٹھیک
کرواتے ہوئے، کبھی گھر کے کسی اور کام کے سلسلے میں۔
زیتون آیا غیر محسوس طور پر گھر ہی کی ہوتی جا رہی
تھیں۔

”اب تو امی کو معصومہ کی دل جوئی سے ہی فرصت
نہیں ملتی۔ باہر کے سارے کام بھی مجھے ہی دیکھنے
پڑتے ہیں۔“ بچے کے اسکول بیگ کی سلامتی کرواتے
ہوئے بھی اسے آواہ لکھتے تو ہو ہی گیا تھا۔ مگر پھر بھی وہ
اپنی مصروفیات مستغل رہتے جا رہی تھی۔

زری کی امی اور نازیلی دونوں ہی کو اس سے بے حد
ہمدردی محسوس ہو رہی تھی۔

”بہت ہی غلط رویہ ہے تمہاری ساس کا، سو کو بھی

وقت کی چائے سب کے لیے ہی بننے لگی تھی۔ یہ
زیتون آپا کی ہدایت تھی۔

چار چھ ہی کپ بنانے ہوتے تھے۔ مگر تادیب کو یہ روز
کا جججھٹ اب کھٹنے لگا تھا اور کھٹنے کو تو اور بھی بہت
کچھ تھا۔ مگر وہ چونکہ احاطے کی عورتوں پر اب تک اپنا
ایک بہت اچھا تاثر چھوڑنے میں کامیاب رہی تھی۔
سو اس وقت بھی سارا غصہ دل میں دبائے، مسکرا مسکرا
کر ان لوگوں کو چائے پیش کر رہی تھی۔ اور پھر اسی
طرح مسکراتی ہوئی، معن میں گل مہرے درخت کے
ساتھ بیٹھی معصومہ کے پاس سے گزرتی ہوئی واپس
پکین میں چلی گئی۔

معصومہ کا دل چاہا کہ اسے اپنے لیے چائے کا بھی
کہہ دے۔ مگر پھر خاموش ہو رہی۔

تھوڑی ہی دیر بعد جب وہ دوبارہ باہر آئی تو زیتون آیا
کو ہی خیال آیا۔

”معصومہ کو چائے نہیں دی تم نے تادیب؟“

”اچھا، نہیں دی؟“ وہ بہت انجان بن کر پوچھ رہی
تھی۔

”پتہ نہیں شاید خیال نہیں رہا۔“

اور یہ خیال اب اسے اکثر ہی نہیں رہتا تھا۔

معصومہ جانتی تھی۔

”اب تو ختم ہو گئی ہے، بناؤں معصومہ؟“

ساری محلے والیوں نے بڑے رشک سے زیتون آیا
کو دیکھا۔ کیسی خدمت گزار، سو انہیں ملی تھی۔
”نہیں رہے دو۔“ معصومہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

ایک دم ہی اسے بہت زور کا غصہ آنے لگا تھا تادیب پر
’برآمدے میں بیٹھی ان ساری مخلص خواتین پر اور
شاید خود پر بھی۔

”ٹھک“ سے کمرے کا دروازہ بند ہونے پر سب ہی
نے ایک دوسرے کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھا۔

”بس یوں ہی ذرا ذرا سی بات پر گھبرانے لگتی ہے۔“

کیا کرے۔ صدمہ بھی تو اتنا بڑا جمیلا ہے۔ ”زیتون آیا
شرمندہ سی ہو کر صفائی پیش کرنے لگیں۔ مگر آج ان
کی ہاں میں ہاں ملانے والوں کی آواز بہت مدہم تھی۔

جی کی جگہ ہی سمجھنا چاہیے۔ تم اپنے میاں کو کیوں نہیں کہتیں۔ اسے زیتون کیا سے بات کرنا چاہیے۔ تم کوئی غلام تھوڑی ہو سارے گھر کی۔

نازی نے پرچوں ہو کر مشورہ دیا۔ معصومہ کی طلاق کی خبر سن کر وہ جتنی اپ سیٹ سی ہو کر ملتان سے لوٹی تھی۔ اب وہ کیفیت بھی بھولی بسری سی بات تھی۔ حالانکہ اس وقت اس نے خود آئندہ سراج کے ساتھ کبھی بھی بحث نہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ مگر اس فیصلے کی عمر بھی اتنی ہی تھی۔ جتنی عام طور پر اس طرح کے فیصلوں کی ہوتی ہے۔ ایک بار پھر وہی وہ تھی۔ وہی سراج کی بے جی اور وہی نہ ختم ہونے والی تکرار۔ ”ایسی چپ چاپ خدمت گزاروں سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ میری بات یاد رکھنا“ اپنے میاں کو قابو میں کرو۔ ”بھئی۔“

نادیہ کے چہرے کی معصومیت اور بھی بڑھ گئی۔ تب ہی دروازہ کھول کر معصومہ نے باہر بھانک کر اسے آواز دی۔

”بھائی! آپ کا فون ہے“ اگر سن لیں۔ ”اپنی بات کہہ کر وہ فوراً ہی واپس پلٹ گئی۔

”دیکھا“ تھوڑی دیر کے لیے میں باہر رک گئی تو فوراً ہی بلاوا آ گیا۔ کام بھی تو آخر اتنے بڑے ہیں کرے گا کون۔ ”وہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر گھر کی طرف چل پڑی۔

معصومہ روٹی پکا رہی تھی۔

نادیہ نے کچن پر ایک نگاہ ڈالی۔ سالن کا چولہا بند تھا اور برتن بھی دھلے ہوئے رکھے تھے۔ وہ اطمینان کا سانس لیتی ہوئی اپنے کمرے میں آگئی۔ جہاں ٹیلی فون کا ایکس مینشن لگا ہوا تھا۔ معصومہ کا چار سالہ بیٹا زیتون آیا کی چارپائی پر ان کے قریب بیٹھا ہل ہل کر ٹیبلیڈ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لاہور سے آنے کے بعد اب تک اس کا اسکول میں داخلہ نہیں ہو سکا تھا۔

معصومہ کو اس کی بھی فکر تھی کئی بار ماں سے کہہ چکی تھی کہ بھائی سے کہہ کر اس کا داخلہ بھی وہیں

کراویں۔ جہاں ان کے دونوں بچے پڑھتے ہیں۔ کہ صبح ہی وین والا آکر بچوں کو لے جاتا تھا۔

”بھائی بھول جاتے ہیں“ آپ انہیں یاد دہانی کراؤں امیں امی! اور زیادہ وقت گزر گیا تو اس کا پڑھنے سے بالکل ہی دل اچاٹ ہو جائے گا۔ ”کام سے فارغ ہو کر وہ ان کے پاس آئی تھی۔

زیتون آپا نے ایک خاموش سی نگاہ معصومہ پر ڈالی۔ اس کے گہرے گلے سے ہورے تھے بال اور چہرہ خشک۔ خود توجہ نہ دیا وہ کب کا چھوڑ چکی تھی۔

زیتون آپا کو معصومہ کے وجود پر چھایا سونا پن دیکھ کر دن میں کتنی ہی بار ہول اٹھتا۔

”اچھا بھلا خوشی خوشی جانے لگا تھا اسکول“ وہاں لاہور میں صبح ہی اٹھ کر۔ ”کچھ کہتے کہتے وہ رک سی گئی۔

لاہور کا ذکر اسی طرح بے ساختہ اس کی باتوں میں آجاتا تھا۔

زیتون آپا اور بھی رنجیدہ ہونے لگیں۔ بات اس سچ پر ختم ہوئی تھی کہ تملانی کسی طور بھی ممکن نہ تھی۔

”اتنی پھاڑی زندگی کس آسے پر کئی کی آخر۔“ انہوں نے دل ہی دل میں معصومہ کی عمر کا حساب لگایا۔ ذہن کسی ایک نکتہ پر آکر بار بار اٹک جاتا تھا۔

”کاش کوئی بھلا آدمی مل جائے تو۔“

رات کو جب نادیہ اور اس کا میاں اشرف ان کے پاس آکر بیٹھے ہوئے تھے تو انہیں معصومہ کی بات یاد آئی۔ اس کے بچے کا اسکول میں داخلہ ہنوز حل طلب تھا۔

انہوں نے آج ذرا زیادہ زور دے کر اشرف کی توجہ اس طرف دلائی تو وہ چند لمحوں کے لیے تو کسی سوچ میں پڑ گیا۔

”معصومہ کا بچہ تو ابھی بہت چھوٹا ہے۔ میرا مطلب ہے کہ ابھی سے اس کی تعلیم پر اتنا زیادہ خرچ کرنے کی کیا ضرورت ہے“ جہاں میرے بچے جاتے ہیں وہاں کی تو فیس بھی زیادہ ہے اور وین کا کرایہ الگ

کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔
صبح کا مخصوص ہنگامہ گھر میں بچا ہوا تھا۔
معصومہ بچوں کے لٹچ باکس تیار کر رہی تھی جب
اشرف کسی کام سے کچن میں آیا۔
”اچھا کرتی ہو، ہو، ہو“ اور بہت اپنی بھابھی کا ہاتھ بنا
دیتی ہو۔ وہ بے چاری تو اس گھر میں مسکین بن کر رہ گئی
ہے۔“

وہ ہر بات میں اپنی بیوی کے لیے ستائش کا پہلو
نمایاں رکھتا تھا۔ معصومہ خاموشی سے اپنا کام کے گئی۔
دس بجے تک وہ بیشتر کام نمٹا کر اپنے بچے کو تیار
کر چکی تھی۔ زیتون کا منظر ٹھیک تھا کہ وہ اس سے بچے
کے دانے کے بارے میں کوئی بات کرے گی۔ مگر اس
نے اشارہ ہی نہ کیا تھا۔ اور خود وہ تو اپنے اندر
اتنی ہمت بھی نہیں پاری تھیں کہ اسے اشرف کا دیا
ہوا صاف جواب سناسکتیں۔

”ای! میں ابھی آتی ہوں تھوڑی دیر میں۔“
معصومہ بیٹے کی انگلی پکڑے کس جانے کے لیے
کھڑی تھی۔ اور محض نسبتاً ”بستر کپڑے پھین کہ
بالوں کو پرش کر لینے سے ہی اس کی دل کی اپنا تاثر جما
رہی تھی۔ ان کی ہیرے جیسی بیٹی کو کس ناقد ری کے
ساتھ ٹھکرا دیا گیا تھا۔

زیتون آپا کو اپنے دل پر کئی آنسو ایک ساتھ گرتے
ہوئے محسوس ہوئے۔

اب تک انہیں پکا یقین ہو چکا تھا کہ معصومہ کی
خوشیوں بھری زندگی کو کوئی بری نظر لگی ہے۔ جلنے
والوں کی کون سی کمی ہے۔ خود وہ جو یہاں بیٹھ کر دن
رات معصومہ کی راج دھانی کے قصے لوگوں کو سنایا
کرتی تھیں اور ایک ایک کو پکڑ پکڑ کر اس کے بھیجے
ہوئے تحائف خیرہ طور پر دکھایا کرتی تھیں۔ ایسی
باتیں کوئی دکھائی اور سنائی جاتی ہیں۔ احاطے میں رہنے
والیوں کے خلاف ان کے دل میں خفگی بڑھتی جا رہی
تھی۔

احاطے میں ابھی بھی معصومہ کے ساتھ کی چند
بچپن کی مسہلہ مال رہ رہی تھیں جو چند بار آکر اسے

ابھی چند سال اسے یہیں کہیں قریب میں داخل کروا
دیتے ہیں۔“
چند کون بعد وہ ایک سوچا سمجھا بیان دے رہا تھا۔
اس کی بیوی نے بھی میاں کو بڑی مطمئن سی نگاہوں
سے دیکھ کر رسالہ اٹھا کر خود کو مزید بے نیاز ظاہر کرنا
چاہا۔

زیتون آپا کو بے حد برا لگا۔
احاطے میں صرف ایک ہی اسکول تھا، کسی نیم
خواندہ اجتماعی کے زیر انتظام تین کمروں پر مشتمل۔
انہوں نے صاف صاف خفگی کا اظہار بھی کر دیا۔
”سوچ سمجھ کر تو چلنا ہی پڑے گا ہی! ویسے بھی اب
تو زندگی بھر کے لیے معصومہ کے بچے کا بوجھ ہم پر آ پڑا
ہے۔ اور صرف پریشان ہی تو نہیں۔ کھانا پینا، کپڑے
ہمارے سر تو یہ ایک اضافی خرچہ آ رہا ہے۔“

چھوٹے سے پردے میں بیدگی نیم ثابت کر سی پر
بیٹھی معصومہ نے بڑے بھائی کو صاف کہتے ہوئے سنا۔
زیتون آپا نے بچی آواز میں شاید اسے کچھ ایسا کہا تھا
جو اسے برا لگا تھا۔ وہ اب پہلے سے بھی اونچی آواز میں
کہہ رہا تھا۔

”ایک تو آپ لوگوں نے معصومہ کا مزہ بھی انتہائی کم
رکھا۔ صرف پندرہ ہزار، معلوم نہیں کس عقل مند کا
مشورہ تھا یہ، جب ہی تو اتنی آسانی سے انہوں نے اسے
چلتا کیا۔ اس کے پاس تو اتنا بھی نہیں ہے کہ خود اپنے
بل پر چھ مہینے بھی گزارا کر سکے۔“ معصومہ کو اپنا چہرہ
گیلا ہوتا محسوس ہوا تو ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی
ہوئی۔ اور سامنے ڈرائنگ روم کے ادھ کھلے دروازے
میں سے گزر کر اندر چلی گئی۔

”زندگی کس وقت کیا کروٹ بدل جائے۔ سان و
گمان نہیں ہوتا۔“ معصومہ نے سوچا۔ ”ابھی زیادہ
وقت نہیں گزرا تھا۔ جب وہ کس بے فکری سے لاہور
کے بازاروں میں پیے اڑایا کرتی تھی اور بھر بھر کر انی
اور بھابھی کے لیے سوغاتیں بھیجا کرتی تھی۔

اگلی صبح معلوم نہیں بخار تھا یا یوں ہی طبیعت ست
تھی۔ انھنے کی ہمت نہ ہونے کے باوجود وہ ناشتہ بنانے

ہے تمہارا "شاہ اللہ بہت پیارا ہے۔" سعد کو بہار کرتے ہوئے اس نے کہا۔

معصومہ دھڑکتے ہوئے مسکرائی۔ خانم اس سے چند سال ہی بڑی تھی اور بچپن سے لے کر شادی ہو جانے تک وہ اس کی اچھی دوستوں میں شامل تھی مگر جب سے اس نے گھر والوں کی مخالفت مول لے کر انوار صاحب سے شادی کی تھی انہوں نے آپا نے معصومہ پر بھی خانم سے ملنے پر کڑی پابندی عائد کر دی تھی۔ یہ سراسر ملاقات ایک اتفاق تھی۔

وہ یقیناً معصومہ پر گزرتے ہوئے سے واقف تھی مگر اس تکلیف دہ موضوع سے بچ کر گزرتے ہوئے وہ اس سے یہاں اس اسکول میں آنے کا سبب پوچھنے لگی۔ تو معصومہ کو ہانا بڑا۔

"اصل میں ابھی پچھوٹا ہے تو اچھا ہے کہ کہیں قریب میں ہی۔"

وہ جلدی سے بات ختم کرنا چاہ رہی تھی۔ خانم کے ساتھ اسے کھانا دیکھ کر کتنی باتیں بتائی جاسکتی ہیں اس کا اسے اچھی طرح اندازہ تھا۔

خانم نے خاموشی سے اس کی بات سنی مگر ایک بے حد رنج بھری بے یقینی جو اس کی آنکھوں میں ابھرنے لگی تھی صاف بتاتی تھی کہ اسے معصومہ کی کسی بھی بات پر یقین نہیں آیا ہے۔

"یہاں قریب میں ہی ایک بہت اچھا اسکول کھلا ہے معصومہ! بالکل واکنگ ڈسٹنس پر۔ میرا بیٹا بھی وہیں پڑھ رہا ہے، تم اسے ایک بار دیکھ لو، چاہو تو ابھی چلتے ہیں۔ یہ باہر جو مین روڈ ہے اسے کراس کر کے جو سامنے والی فلی آتی ہے نا وہیں۔"

"فی الحال تو ہمیں ٹھیک ہے۔ کوئی ایسا برا بھی نہیں ہے یہ اسکول اور پھر ابھی ابھی تو میں نے انڈمیشن کروایا ہے یہاں۔"

تیزی سے اس کی بات کو کاٹتے ہوئے معصومہ کو اپنے الفاظ خود کھوٹنے سے لگے مگر وہ جلد سے جلد اس کے پاس سے ہٹ جانا چاہتی تھی۔ سو "خدا حافظ" کہتے ہوئے جلدی سے آگے بڑھ گئی۔

اپنے گھر آنے کا کہہ کر گئی تھیں۔ زحون کیا کوئی خیال گزرا کہ شاید وہ ان کی طرف جانے کا پتہ گرا رہا ہو جیسی ہے تو وہ اطمینان سے پوچھنے لگیں۔

"کسی سبیلی کی طرف جارہی ہو۔ اچھا ہے تھوڑا بہت گھر سے بھی لگا کر۔ میں تو کب سے کہہ رہی ہوں۔"

"نہیں ای! سعد کا داخلہ کرانے جارہی ہوں۔ یہیں احاطے والے اسکول میں۔ میں نے سوچا ابھی تو پچھوٹا ہے، بچپن قریب میں جایا کرے گا تو مجھے بھی اطمینان رہا کرے گا۔"

وہ ان سے کہتے ہوئے فوراً ہی دروازے کی طرف مڑ گئی۔ زنتون آپا کے صحت میں الفاظ اٹکے ہی رہ گئے۔ "اچھا ہے جو معصومہ نے ان کی طرف مڑ کر نہیں دیکھا۔ اس کا بھی پرہیز کیا اور میرا بھی۔"

خود کو بڑا بے یقینی سا محسوس کرتے ہوئے انہوں نے تکیے سے ٹیک لگائی۔

"ای! آج کیا پکاٹا ہے۔ پتہ بتجئے۔" غور سے سر پر کھڑی فرماں برداری سے پوچھ رہی تھی۔

"جو مرضی ہو۔" رکھلی سے کہتے ہوئے انہوں نے دوسری طرف کروٹ بدلی۔

"تنگ دلی اور منافقت کو کس کامیابی کے ساتھ چھپا کر رکھا جاتا ہے اس کا تجربہ بھی انہیں اسی عرصے میں ہوا تھا۔"

معصومہ بچے کا داخلہ کر دیا کر نکلی تو پہلے سے زیادہ مضطرب تھی۔ رنگ اڑی دیواروں والے تاریک سے کمرے، خستہ بیچیں اور گریخت چہرے والی استانی جو علوتا ہی چیخ چیخ کر بول رہی تھی۔ خود سعد بھی بہت سہما ہوا تھا۔

"ہیں اس اسکول میں نہیں پڑھوں گا اس میں تو بے ایریا بھی نہیں ہے۔ میرا لاہور والا اسکول کتنا اچھا تھا ہم واپس اپنے گھر چلیں گی۔"

معصومہ کو خود پر قابو پانا مشکل محسوس ہو رہا تھا۔ تب ہی کسی کی آواز پر اسے رکن پڑا۔

"کیسی ہو تم؟" خانم قریب چلی آئی۔ "اور یہ بیٹا

گھر ہر بھی اس کا کسی بات میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ بار بار یہ خیال آتا رہا کہ خانم کے بتائے ہوئے اسکول کو ایک بار جا کر دیکھ ہی آئے تو کیا برا ہے۔ دوپہر کو اس نے زنتون آپا سے بھی اس خیال کا اظہار کر دیا تو وہ ایک دم ہی چونک کر سیدھی ہو بیٹھیں۔

”خانم کے ساتھ کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے“ اسے تو کوئی اچھی نظر سے دیکھتا نہیں ہے۔ تمہارے لیے بھی خدا انخواست کسی نے کچھ ایسا دیا کہ دیا تو۔ ”معصومہ کی نگاہ جیسے زمین میں گڑی گئی۔

دل پر پڑا بوجھ اور بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ سعد نے احاطے والے اسکول میں جانا شروع کر دیا تھا۔ بظاہر سبھی کچھ ٹھیک تھا۔

سب سے زیادہ اشرف اور نادیہ مطمئن دکھائی دے رہے تھے۔ شام کو نادیہ اپنے بچوں کو ٹیبلے پر سے چیز دلاتی تو آوازیں دے دے کر سعد کو بھی بلاتی۔ اسے معصومہ نے ابھی تک باہر کی چیزیں کھانے کی عادت نہیں ڈالی تھی اور پھر وہ چھوٹا بہت تھا۔ کئی آوازوں پر شرماتا ہجکتا ہوا کبھی آتا، کبھی نہیں۔

نادیہ کا مقصد ہر حال اس دوران پورا ہو ہی جاتا تھا۔ ”نادیہ اپنے بچوں اور معصومہ کے بیٹے میں کوئی فرق نہیں رکھتی۔“

سب کی زبان پر ایک ہی ہلکا ہوتا۔ اب وہ اچھے بیٹے ملنے جلنے والیوں سے معصومہ کے لیے کسی مناسب رشتے کا بھی ذکر کرنے لگی تھی۔

”ثواب کا کام ہے“ جتنی جلدی ہو جائے تو اچھا ہے۔ زیادہ دن بیٹھی رہی تو ڈر لگتا ہے کوئی ایسی دلی بات نہ بن جائے۔ زمانہ بہت برا ہے۔“

محلے کے ایک گھر میں محفل میلاد تھی۔ اپنے اور کل مومنین کے گناہ صغیرہ، کبیرہ بخشے جانے کی دعا کرنے کے فوراً بعد ہی ساری عورتیں ٹولیوں میں بیٹھ کر پھر سے اسی من پسند مشغلے میں مصروف تھیں۔

آج زنتون آپا بھی ساتھ آئی ہوئی تھیں اور تھوڑے سے ہی فاصلے پر اپنی ہم عمر خواتین کے ساتھ

بیٹھی تھیں۔ ”آج کل تو بہت مشکل ہے بھائی! اچھی اچھی لڑکیاں کنواری بیٹھی ہیں۔ طلاق یافتہ کے لیے تو کون تیار ہو گا۔“ نازی کو مکان میں بیٹھی ٹھکت کا دکھ ستائے لگا۔

”ہمیں کون سا اب کوئی بہت خوبوں والا رشتہ درکار ہے معصومہ کے لیے۔ بس شریف آدمی ہو، چاہے بیوی مر چکی ہو یا طلاق دے چکا ہو، کوئی فرق نہیں پڑتا۔“

اپنی ساس کی موجودگی کے خیال سے ہی شاید وہ نیچی آواز میں بول رہی تھی۔

ہر ایک کو اس کی بات معقول لگ رہی تھی۔ ظاہر ہے کہ معصومہ بھی ایک بچے کی ماں تھی، اس کے لیے اس سے بہتر کالور کیا تصور کیا جاسکتا تھا۔

وہیں بیٹھے بیٹھے زری کی امی نے ایک بہت مناسب رشتہ ڈھونڈ بھی لیا۔

ان کے کوئی رشتے کے بھائی تھے جن کی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا۔ رشتہ زندگی گزار رہے تھے اور دونوں شادی شدہ بیٹے کینڈا میں سیٹھل تھے۔

”ایک اور انوار صاحب!“ ان میں سے کسی نے ہنس کر بڑی سفاک صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔

”ہم یہ کام کوئی چھپ چھپا کر تھوڑی کریں گے، چار لوگوں کے سامنے کیا جائے گا۔“ نادیہ نے انوار

صاحب کی مثال دینے والی کو فوراً ہی ٹوکا۔ خانم کا گناہ اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی اسی طرح یاد کیا جاتا تھا۔

سب کچھ بھول کر زری کی امی اور نادیہ تفصیلات طے کرنے لگیں۔

رضوانہ کو بھی زری کی امی اپنے ساتھ ساتھ ہی رکھتی تھیں۔ حالانکہ جب سے سب کو اس کا خانم کی طرف ہلکا سا جھکاؤ محسوس ہوا تھا، وہ اس سے تھوڑی سی کچھنی کچھنی رہنے لگی تھیں پھر بھی محلے داری کی مروت بھی آخر کوئی چیز تھی۔

”معصومہ ابھی کم عمر ہے، آپ لوگ سوچ سمجھ کر

فیصلہ کیجئے گا۔ بے چاری پہلے ہی ایک بڑا دکھ اٹھا کر بیٹھی ہے۔

رضوانہ سے آخر کار رہانہ گیا تو کہہ ہی گئی۔
نادیہ نے ایک گہری سانس لے کر اس کی طرف دیکھا۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اس نے بمشکل ہی رضوانہ کو کچھ کہنے سے خود کو باز رکھا ہے پھر زری کی امی کی طرف دیکھتے ہوئے بڑے جتانے والے انداز میں بولی۔

”میں رات کو آپ کے گھر آؤں گی آئی! یہ باتیں یہاں کرنے والی ہیں بھی نہیں۔“
گھر والے کھانا تک جانے کی اطلاع دے رہے تھے، عورتوں کو ذرا دیر کے لیے ہر دو سراسر موضوع بھول گیا تھا۔

حالانکہ اندازہ بھی تھا پھر بھی اس نے ایک بار پھر اپنا پرس کھول کر سارے خانے چیک کر ڈالے۔ مگر وہی مایوسی۔

بڑی امید کے ساتھ الماری کی دراز میں بھیجے ہوئے اخباروں تک کے نیچے ہاتھ پھیر کر دیکھ لیا مگر اب اس کے پاس اتنے پیسے ہی کب تھے کہ رکھ کر بھولنے کا سوال پیدا ہوتا۔

یہ ساری گزرے زمانے کی باتیں تھیں۔ یا ہر سے اشرف اور نادیہ کے بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ صبح سویرے وہ ضرور کسی نہ کسی خرچ کا تذکرہ چھیڑے رکھتی۔

”تم فکر مت کرو، آج کچھ نہ کچھ انتظام کر کے ہی آؤں گا۔“ اشرف کی تسلی دیتی آواز معصومہ کو بھی سنائی دے رہی تھی۔ اس نے سامنے کھڑے سعد کو جو بڑی امید بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”دیکھو سعد! تم آج اپنی مس سے کہنا کہ۔“ وہ اسے سمجھانا چاہ رہی تھی مگر وہ رونے لگا۔

”اگر آپ مجھے پیسے نہیں دیں گی تو میں اسکول نہیں جاؤں گا۔“ نیچر بہت انسٹل کرتی ہیں۔ کل بھی

انہوں نے میرے دونوں ہاتھوں پر اسکیل مارے تھے اتنے زور زور سے۔ ”اپنے دونوں ہاتھ اس کے سامنے پھیلاتے ہوئے وہ مستقل بولے جا رہا تھا۔

معصومہ کو یہ تھا کہ سعد کے اسکول میں بات بات پر تھپڑ مارنا معمول کی بات ہے مگر کل جو سالانہ فنکشن کے سلسلے میں پیسے نہ لانے پر سعد کی پٹائی ہوئی تھی۔ وہ بڑی تکلیف دہ تھی۔

رات کو وہ سوتے میں بھی وہ روتا رہا تھا اور خود معصومہ؟

”پپلو“ میں خود چل کر تمہاری نیچر سے بات کرتی ہوں۔“ وہ اسے بسلا کر اسکول کے گیٹ تک لے لے آئی۔

ابھی اسبلی کے لیے نیل نہیں ہوئی تھی اور ہیڈ ماسٹریس صاحبہ جو خود بھی اسکول کی اوپری منزل میں رہائش پذیر تھیں، گیٹ کے باہر کھڑی بچوں کی چیکنگ میں مصروف تھیں۔

”میری ایک چھوٹی سی درخواست ہے آپ سے۔“ بڑی عاجزی کے ساتھ اس نے انہیں اپنی وقتی مجبوری سے آگاہ کرنا شروع کیا تو وہ بڑے ہی آگاہ ہوئے انداز میں ادھر ادھر دیکھنے لگیں۔

معصومہ کو اپنی بات پوری کرنا مشکل ہو گئی۔ ٹھیک کسی پیشہ ور چندہ جمع کرنے والے کی طرح وہ ان کے سامنے کھڑی ان کے جواب کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ اسے بھول کر کسی ”کلام کی آسامی“ کے ساتھ خوش اخلاقی برتنے لگیں۔ مگر ابھی تک انہوں نے سعد کو بھی کلاس میں جانے کے لیے نہیں کہا تھا۔ وہ معصومہ کا ہاتھ پکڑے وہیں کھڑا تھا۔ حالانکہ اس کے آتے جاتے دوست اسے بلاتے بھی رہے۔

معصومہ صبر کے ساتھ کھڑی ان کے فارغ ہونے کا انتظار کرتی رہی اور جب وہ فارغ ہو کر مڑیں تو اسے اب تک کھڑا دیکھ کر بری طرح جھنجھلا گئیں۔

”نہیں بھی نہیں ہمارے ہاں اس طرح نہیں چل سکتا۔ آپ لوگوں کو بس اپنے پیسے بچانے کی فکر رہتی ہے ہر وقت۔ جیسے بھی ہو، بس مفت میں کام چلتے رہنا

اس بار بھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ وہ اس وقت تک بھی روکنا نہیں چاہتی تھی۔

فصل دو: زمین سو رہیوں کی خاطر۔ ایک بالکل ہی نئی گزری عورت کے ہاتھوں وہ اس طرح ڈھیل ہو کر رہ جاتے گی گھر سے نکلتے ہوئے اسے یہ خیال تک نہ تھا۔ ان لال ہرے نیلے نونوں کو لاپرواہی سے خرچ کرتے ہوئے اس نے جس خوشی اور ایکساٹمنٹ کو ہمیشہ محسوس کیا تھا اس میں ایسے کسی وقت کا اہلا و ہم بھی کب سنا تھا۔

”تو پھر وہ سب ٹھیک ہی ہے جو تیرے اور زری کی اماں مل کر کر رہی ہیں“ خود میری بھلائی کی خاطر۔ ”پوری آسانی سے اس نے ان سب کو ”باعزت بری“ قرار دے دیا جن سے وہ بے حد خفا تھی۔

”اور کچھ نہیں تو پرس تو تو لوں سے بھری رہا کرے گا۔ زندگی میں آئی ہر پھولی بڑی مشکل کا قفل کھولنے کے لیے۔“ ان کتھن گھڑیوں میں اس نے ایک بالکل سستی کی ضمانت کے احساں کو بچکانے کی کوشش کی جس کے بدلے میں وہ نامزدگی خود اپنی ہی نگاہوں میں مستحکم کرنے کے لیے تیار تھی۔

اچانک کے آخری سرے پر بنے ہوئے اپنے چھوٹے سے گھر کے گارڈن میں داخل ہوتے ہوئے آذر نے ایک بار پھر پلٹ کر دیکھا۔

معصومہ اور اس کا بیٹا دونوں ہی اب وہاں نہیں تھے۔

آنسوؤں سے لبریز آنکھیں اس کے ساتھ ساتھ ہی گھر میں داخل ہوئی تھیں۔



زیتون آبا کا بخار لوٹنے کا ہم نہیں لے رہا تھا۔ ٹاویہ بوکھلا کر بار بار ٹپ ٹپ چبک کرتی۔ اشرف کو ڈاکٹر نے لے کا مشورہ دیا۔ اسے سب سے زیادہ فکر اس بات کی تھی کہ زری کی امی نے جو رشتہ بتایا ہے وہ اس تاخیر کے جب واپس نہ لوٹ جائے۔

”اچھا بھلا یہ کام اب تک ہو بھی چکا ہوگا۔ وہ تو

چاہیے۔ میں خوب سمجھتی ہوں ایسے ہتھکنڈوں کو۔ لے جاؤ واپس اپنے بچے کو۔ باب پیسے ہوں تب لے کر آئیے گا۔ ہم نے کوئی رفاہی ادارہ تھوڑی کھول رکھا ہے۔“

بالکل ٹپ ٹپ سٹل پر کھلے غیر رجسٹرڈ اسکولوں میں روا رکھا جانے والا عام رویہ۔

معصومہ دفترا ہی بچے کو کھینچتی ہوئی وہاں سے واپس مڑ گئی۔

”ارے ہاٹ تو سینے“ بچے کو چھوڑ جائیں۔ پیسے کل ہی بھجوا دیے تھے۔“

ہینر مشینیں صبح کو صبح ہی صبح ہونے والے نقصان کا خیال کیا تو وہ پیچھے سے آواز دے کر اسے روکنے لگیں۔ انہیں اصل میں معصومہ کے اس رد عمل کی توقع تھی بھی نہیں۔ یہاں اکثریت ان ہی بچوں کی تھی جن کے والدین بے حد معمولی فیس دینے کی سکت رکھتے تھے، سو وہ لوگ ان کی ہری بھلی سن بھی لیتے تھے۔

”سینے“ سینے۔“

معصومہ کو ان کی آواز اپنے پیچھے سنائی دیتی رہی مگر اس نے ایک بار بھی پیچھے مڑ کر دیکھنے کی تکلیف گوارا نہیں کی۔ جتنا تیز ممکن تھا وہ چل رہی تھی۔ سعد بے چارے کو اس کا ساتھ دینے کے لیے بھاگنا پڑ رہا تھا مگر معصومہ کو اس وقت یہ بھی اصرار نہیں آ رہا تھا۔ بار بار آنکھوں کے سامنے منظر دھندلانے لگا۔ تب ہی اس دھندلاتے منظر میں اس نے ایک دراز قد شخص کو قریب آتا دیکھا۔

”اسلام علیکم اکل۔“

سعد نے بہت زنجوش ہو کر سلام کیا تھا۔ وہ چند منٹ کے لیے رکتا بھی چاہتا تھا۔ مگر معصومہ اس وقت رکنے کے موڑ میں بھی قطعی نہیں تھیں۔

”تیز چلو سعد۔“ بھٹکی ہوئی آنکھوں کو رگڑتے ہوئے سعد کو کھینچتے ہوئے آگے بڑھتی چلی گئی۔

”ہم وہاں کے گارڈن میں کبھی کبھی کھیلنے جاتے ہیں امی۔“ اس نے پیچھے مڑ کر دو اشارہ کیا۔ معصومہ نے

صرف چار آدمی ساتھ لاکر نکاح پر جھوٹا چاہ رہے ہیں اور ہمیں اب کوئی دھوم دھڑکاؤ کرنا نہیں ہے۔ امی کی بیماری نے سارا پروگرام ٹھپ کر کے رکھ دیا ہے۔

وہ بہت بخاری سی اٹھتے بیٹھتے ہی ذکر کیے جاتی۔
 "تو اب کیا کیا جاسکتا ہے۔ امی سے بستر سے اٹھا نہیں جا رہا ہے۔ ایسے میں تو کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا ہے۔" اشرف کو ہر حال میں سے محبت بھی تھی، بار بار کے اس ذکر سے چڑھی گیا۔

"مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ امی کو یہ رشتہ پسند ہی نہیں آیا ہے۔" اشرف کے جھنجھالنے کو ذرا بھی خاطر میں لانے بغیر یہ بڑے پر یقین لہجے میں کہہ رہی تھی۔ "دیکھ نہیں رہے ہو جس دن ذری کی امی فرید صاحب کو ملوانے کے لیے لائی تھیں، امی نے اسی دن سے بستر چڑا ہوا ہے۔"

"تمہارا وہ ہے، ایسی کوئی بات نہیں۔" اشرف کھوکھلی سی ہنسی بٹھایا۔

ایمان داری کی بات یہ کہ خود وہ بھی فرید صاحب سے مل کر تھوڑی دیر کے لیے شاکدہ رہ گیا۔
 وہ کسی طرح بھی معصومہ جیسی پیاری لڑکی کے لائق نہیں تھے۔ ان کی واحد قبولی صرف وہ بے تحاشا جیسہ تھا جو ان کے کینڈا میں مقیم دونوں بیٹے بڑی فرماں برداری کے ساتھ انہیں بھیج رہے تھے۔ ہر یہ اگر اس پر پوری طرح حاوی نہ ہوتی تو وہ ایک منٹ کی بھی دیر کیے بغیر انہیں منع کر چکا ہوتا۔

"آج کل کے زمانے میں سب پیسے کو سلام کرتے ہیں اشرف! فرید صاحب کے ساتھ زندگی سنور جائے گی معصومہ کی اور سب سے بڑی بات سعد کا مستقبل محفوظ ہو جائے گا۔"

فرید صاحب کے ویلفئرس کے ہزار گز والے شاندار گھر سے واپسی پر وہ بڑی دل سوزی سے اس سارے معاملے کے تمام تر روشن پہلو اس کے سامنے رکھتی آئی تھی۔

اشرف کو اپنی بیوی کی نیک نیتی اور معصوم فطرت

اچھی لڑکی ملنا بھی کون سا مشکل ہے۔ وہ تو زری کی امی کا احسان ہے کہ انہوں نے فرید صاحب کو ہمارے گھر کے لیے راضی کر لیا ہے۔

نادیہ کی آواز دل پر لکھی پن کی طرح چبھ رہی تھی۔ ان کی پیاری بیوی جس کی خوبیوں کا چرچا کرتے نہ وہ جھٹکتی تھیں اور نہ احاطے کی دوسری عورتیں۔

اگر معصومہ اس طرح ٹھوکر کھا کر واپس نہ آئی ہوتی تو شاید زندگی بھر بھی وہ نادیہ کے اس دوسرے رخ کو نہ دیکھ پاتیں۔

ایک ٹھنڈی سانس لے کر وہ چپ چاپ واپس لیٹ گئیں۔

نادیہ اور اشرف ایک دوسرے کی شکل دیکھنے لگے۔ ایک کی آنکھوں میں جھنجھلاہٹ تھی اور دوسرے کی آنکھ میں کھسیاہٹ۔

”یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی امی!“ اشرف اس بار ذرا غصے میں بولا۔ ”نادیہ بے چاری اتنے جتن کر کے معصومہ کو دوبارہ بسانے کی فکر کر رہی ہے اور آپ ہیں کہ پریشانی کو اور بڑھائے دے رہی ہیں۔“

معصومہ گھبرا کر بھائی کی طرف دیکھنے لگی۔ سب ہی کو پتہ تھا کہ وہ غصے کا تیز ہے۔

”بھائی! امی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“

”اللہ نے چاہا تو دو چار دن میں امی کی طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔ ہم تو یہ کہہ رہے ہیں کہ انہیں اب حتمی ہماری طرف سے جواب مل جانا چاہیے۔ آخرا بات اتنی بڑھ چکی ہے۔“

بات بڑھانے والی بھی وہ خود تھی اور پھیلانے والی بھی۔ احاطے کی آدھی عورتوں کو نادیہ کی زبانی اور باقی آدھی کو زری کی امی کی زبانی اس انقلاب کی خبر مل چکی تھی جو معصومہ کی زندگی میں آنے والا تھا۔

ماحول میں بڑی ناقابل برداشت سی ٹھٹھن بڑھنے لگی تو معصومیوں کا چھوڑا ہوا دودھ کا آدھا بھرا کپ اور چھوٹی ٹرے اٹھا کر باہر نکل گئی۔ بے حسی کی ایک دبیز چادر جو وہ اپنے وجود پر ڈھانپے رکھنا چاہتی تھی بار بار پھسلنے لگی تھی۔

پہلے ہی بے حد بھروسہ تھا، اب اور بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ اس کی بیوی سے زیادہ اس کی بہن اور ماں کا خیر خواہ دوسرا اور کون تھا بھلا؟

”امی! اب آپ خود کو سنبھالیے۔“ اسی رات وہ زیتون آیا کی چارپائی کے پاس کرسی ڈالے بڑے رساں سے وہی کچھ کہہ رہا تھا جو نادیہ نے اس سے کہلا انا چاہا۔ ”ہمیں معصومہ کے فرض سے بھی سبکدوش ہونا ہے، یہ تو ہماری خوش قسمتی ہے کہ فرید صاحب جیسا دولت مند شخص خود چل کر ہمارے اس چھوٹے گھر میں آیا ہے۔ اب سمجھ داری اسی میں ہے کہ ہم لوگ بھی تاخیر نہ کریں، ورنہ خدا نخواستہ کہیں کوئی موقع سے فائدہ نہ اٹھالے، آخر کو پیسے والے آدمی ہیں۔“

زیتون آیا کا بخار اس وقت ذرا کم تھا۔ نادیہ بڑی سعادت مندی سے انہیں دودھ میں ڈبل روٹی بھگو کر کھلا رہی تھی۔

ان کے چہرے کا پھیکا پڑتا ہوا رنگ صرف پائنتی کی طرف بیٹھی معصومہ نے ہی نوٹ کیا۔

”یہ سعد۔ شاید باہر نکل گیا ہے، میں دیکھتی ہوں۔“ دل میں اٹھتی ہوئی آہ کو دباتے ہوئے معصومہ اٹھ گئی۔

”تم بھی بیٹھو معصومہ! تمہیں اپنی رائے استعمال کرنے کا پورا حق ہے۔ دیکھو ہم جو کچھ بھی کرنا چاہ رہے ہیں تمہاری بھلائی کے لیے ہی ہو گا۔“ نادیہ کے اصرار پر اسے واپس بیٹھنا پڑا۔

”بھلائیہ کیسا حق ہے جو اسے صرف ان لوگوں کی ہی منتخب کر وہ رائے کی صرف توثیق کرنے کی اجازت دے رہا ہے۔“ وہ صرف سوچ کر رہ گئی۔

زیتون آیا کا دل بالکل بھی نہیں مان رہا تھا۔

بار بار یہی خیال ستا رہا تھا کہ اگر معصومہ کی جلد از جلد شادی کے بجائے انہوں نے اسے کم از کم گریجویشن ہی کرنے دیا ہو تا تو آج شاید وہ اشرف اور نادیہ کو بہتر جواب دینے کی پوزیشن میں ہوتیں۔

”فرید صاحب کو تو کنواری اور معصومہ سے زیادہ

اور نادیہ کہہ رہی تھی۔

”خانم کی مثال سامنے ہے۔ خدا نہ کرے کل کو ہماری معصومہ سے بھی کوئی غلطی ہو گئی تو پھر۔“

زیتون آپا نے بہت بے چین ہو کر گروٹ بدل دی۔

”آج صبح سے دوبار آجکی ہے آپ کی طبیعت پوچھنے کے لیے مگر میں دروازے سے ہی ٹالے جا رہی ہوں اسے کہ آپ کو تو ویسے ہی اس کی شکل سے چڑ ہے۔ یہاں آئے گی تو اور ٹینشن ہوگی۔“

تب ہی دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔

”میرے خیال میں پھر وہی آئی ہے۔“ نادیہ بہت بے زاری سے اٹھتے ہوئے بولی۔ ”ایسی عورتوں کو شرم تھوڑی ہے۔ ایک نمبر کی ڈھچٹ ہیں، لاکھ کوئی ٹالنا رہے مگر۔“ وہ دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بلند آواز سے اظہار خیال کرتی جا رہی تھی کہ عقب سے زیتون آپا کی آواز ابھری۔

”خانم کو دروازے سے واپس مت کرنا نادیہ! اسے یہاں میرے پاس لے کر آؤ۔“

نادیہ نے مڑ کر بہت بے یقینی سے ان کے منور اور بیمار وجود کو دیکھا۔

خانم اس بار ایسی نہیں آئی تھی، اس کے ساتھ رضوانہ بھی تھی جسے وہ شاید اس امید پر ساتھ لائی تھی کہ دروازے سے ہی دھتکاری نہ جائے۔ نادیہ اور اس کامیاب دونوں ہی کمرے سے جا چکے تھے۔

”بہت دن سے آپ کی طبیعت کا رضوانہ سے سن رہی تھی مگر آنے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔“ خانم اپنے مخصوص نرم لب و لہجے میں ان کی مزاج پر سی کر رہی تھی۔ اصل میں تو وہ خود اب تک زیتون آپا کے محبت بھرے خیر مقدم پر حیران تھی۔

زیتون آپا معلوم نہیں کچھ سن بھی رہی تھیں یا نہیں۔ کسی گہری سوچ سے ڈوبتے نکلنے ان کی نگاہیں مستقل ہی خانم کے سادہ سے پرکشش چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

وہ ان کی معصومہ سے محض چند سال ہی تو بڑی تھی۔ انہیں اچھی طرح یاد تھا۔

معلوم نہیں کیوں بار بار خانم کا چہرہ — معصومہ کا روپ دہار لیتا تھا۔ زیتون آپا نے بہت غور سے ایک بار پھر اسے دیکھ کر یہ جاننا چاہا۔

پتہ ہی نہیں چلا کہ آپا نے وہ اور معصومہ بالکل ایک جیسی لگنے لگی تھیں۔ اتنی گہری شباب تھی۔

وہ خانم کے ذرا اور نزدیک کھسک آئیں جیسے بہت اچانک ہی انہیں اور اک ہوا ہو۔

خانم ”انوار صاحب“ معصومہ اور فرید صاحب۔ سارے نام اور شکلیں آپس میں گڈمڈ ہوئی جا رہی تھیں اور اس سخت الجھن میں وہ اس سب سے ترس چلائی کی روح چھو کر پلٹیں جس نے خانم کو کوچہ ملا مت کی راہ دکھائی۔

اور جھپٹتے کا وہی تیز دھار راستہ اب معصومہ کے قدموں تلے پھٹنے کے لیے تیار تھا۔

بے حد خوفزدہ سی ہو کر انہوں نے اپنے سرد ہاتھوں سے خانم کا نرم و ملائم ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھاما۔

وہ جو کچھ بھی کہنے جا رہی تھی اسے بھول کر حیران سی ہوئی۔ زیتون آپا کو دیکھنے لگی۔

”خانم! ان کی کپکپاتی سرگوشی فضا میں ابھری۔“

”میں نے سنا ہے کہ تم لوگ آذر بیک کے لیے رشتہ دیکھ رہے ہو۔ اپنی معصومہ کے لیے کوشش کرو نا، ایسا خیر و سی راضی ہو جائے۔“

ایک امکان جسے انہوں نے خود ابھی ابھی روشن بنایا تھا خانم کے لیے بھی انتہائی غیر متوقع تھا۔

”مگر زیتون آپا!“

اس نے شاید آذر کے حوالے سے پھیلی ہوئی بے بنیاد باتوں سے ہی گھبرا کر کچھ کہنا چاہا مگر کہہ نہ سکی۔

زیتون آپا کی بات ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔

”تمہارا بھتیجہ بہت برا احسان ہو گا خانم! میں زندگی بھر بھی شکریہ ادا کرتی رہی تو بھی تمہیں اس احسان کا ایک حصہ ادا نہیں کر سکوں گی۔“

وہ دفعہ ”ہی خانم کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام کر آنکھوں سے لگاتے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

